افسانے

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

راجندر سنگھ بیدی

کرشن چندر کے نام

فہرست

پیش لفظ

ایک محاورہ ہے: جتنے منہ اُتنی ہی باتیں۔

اس لیے مختصر افسانے کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا، البتّہ اس کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کہانیوں کا تعلق ہے ''پنچ تنتر'' کے قصّوں اور ''الف لیلی'' کی داستانوں سے لے کر بریٹ ھارٹ اور جونا بارے تک بیچ میں ہزاروں ہی لوگ آئے اور اپنی بات اپنے ہی منفرد طریقے سے کہتے رہے۔ کسی نے رومان کو اپنا ایمان بنایا اور تحیّر کے عنصر کو کہانی کی جان قرار دیا، پڑھنے والے کو ایسی پٹخنی دی

کہ ہوش آ گئے یا اڑ گئے! (تعلی کے مضمون میں ہوش آ جانا یا اُڑ جانا ایک ہی بات ھے) چیخوف کی طرح کے بھی آئے جن کو زندگی کے صحرا میں بڑا ساتربوز مل گیا اور انہوں نے بڑے پیار، بڑی ہمدردی سے اس کی چھوٹی چھوٹی پھانکیں کاٹیں اور سب کے ہاتھ میں تھما دیں۔ لارنس نے حیات کی نیم غنودگی میں رنگ و بو کا لخلخہ سونگھا اور دوسروں کو بھی سنگھا دیا۔ جو برداشت کر گئے ان کی تو آنکھیں کھل گئیں اور جو نہ کر سکے آج تک چھینکیں مار رہے ہیں۔ ایڈگر ایلن پو نے کہا "کہانی کا ہر وہ حصّہ جو برق و تجلّی ہو کاٹ دو کیونکہ وہ شب رنگ کہانی کے

مجموعی تاثر کو دبا دے گا۔" اور وہ یہ بھول ہی گئے کہ ایسی کہانی بھی لکھی جا سکتی ہے جس میں دن کا رنگ غالب ہو۔ خودکشی سے چند ہی مہینے پہلے ہیمنگوے نے کہا کہ "میں نے اپنی تحریروں میں طالسطائی اور بالزاک، موپاساں اور چیخوف کو سمو لیا ہے۔" اور یہ امر واقع ہے کہ ان کی کہانیوں میں ہمیں ان سب استادوں کا ایک خوبصورت سا امتزاج نظر آتا ہے۔ البتّہ اسٹائل میں کھردرا پن، کردار اور مواقع میں تشدّد ان کا اپنا تھا کیونکہ انہوں نے زندگی کو اسی رنگ میں دیکھا تھا جو انہی

کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ زندگی کو دوسرے کے رنگوں میں قبول کرنے والے نہ تو سومرسٹ ماہم کی کلبیت سے انکار کرسکتے ہیں اور نہ ژیاں پال سارتر کی عصبیت سے اور نہ ولیم فاکنر کی یاسیت اور قنوطیت سے۔

اپنے اور صرف اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے والوں کو جاننا چاہیے کہ اگر اونٹ ان کی نظر سے اونٹنی کی طرف دیکھے گا تو کبھی اس پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ آج جب الیکٹرونک مشین پر نظمیں لکھی جا رہی ہیں کہانیاں قلم بند ہو رہی ہیں اور Artificial Insemination سے بچے پیدا کیے جارہے ہیں تو ہماری اولاد کو ایفروداسٹے (Aphrodite) اور دمیتری یاس (Demetrius) کی داستانوں کو خوبصورت قصّوں کی صورت میں یاد رکھنا ہو گا، حالانکہ ان کے زمانے میں تو مرد کا سر

کدو کی طرح تھا اور عورت کے کولہے اور چھاتیاں سیتا پھل کی مانند۔ تو گویا ہنری جیمز، کیتھرین منسفیلڈ، اوھنری اور ولیم سرویاں تک پہنچتے پہنچتے افسانے میں انفرادیت کے علاوہ رچاؤ اور گہرائی اس قدر بڑھ گئی کہ ان کے افسانوں کی ایک

ایک سطر اپنے اندر کئی کئی افسانے لیے ہوئے تھی۔ پھر ٹیگور کی کہانیوں کی نظمیہ کیفیّت، شرت چیٹر جی کی گھلاوٹ، جیسے شکنجبین کی مصری، پریم چند کی سادگی اور ان کا خلوص جو بعض وقت مہاشائیت ہو کر رہ جاتا ہے۔

غرضیکہ جتنے منہ آتی ہی باتیں، جتنے منہ ان سے زیادہ باتیں۔ اور پھر ان میں سے ایک میرا منہ جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ اسے بڑے شوق سے دیکھیے، ہنسیے یا روئیے (تعلی کی زبان میں ہنسنا یا رونا ایک ہی بات ہے۔) لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیے کہ منہ دیکھتے رہ جانا بھی ہماری زبان کا ایک محاورہ ہے۔

ہمارے پرانے فلسفیوں کے مطابق یہ دنیا ایک تخیّل ہے۔ ہم شروع اور آخر کے انداز میں سوچنے والے اس تخیّل کی تہہ کو پا نہیں سکتے لیکن اپنے اندر اس عظیم تخیل کی حدوں کا ایک دھندلا سا تصوّر باندھ سکتے ہیں۔ پھر:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اب اس خیال کو دامِ خیال میں لا کر ہم نے ایک افسانوی طرز کی سازش پیدا کر لی

جس کی جزا افسانے کی صورت میں ملی اور سزا عمر قید کی شکل میں۔ افسانہ۔۔۔ طویل یا مختصر۔۔۔ کے تصوّر سے شروع ہوتا ہے جو ایک سے انیک اور انیک سے پھر ایک ہو جاتا ہے۔ عجیب سازش ہے نا کہ ابتدا میں انجام چھپا ہو اور انجام میں ابتدا کی صورت ہو۔ اسی چکر کو افسانہ کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے افسانہ ایک خواب ہو جس میں ہم کھو جائیں اور اکثر اوقات جاگنے پر بھی جی چاہے کہ سرہانے میں آنکھیں دبا کر پھر سے وہ خواب دیکھیں جس میں کسی حور نے کہا تھا۔ ''میں تھوڑی دیر میں آؤں گی۔''لیکن اس کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ٹیلیفون کی گھنٹی نے جگا دیا۔ اب ٹیلیفون پر کوئی خان کہہ رہا ہے۔ ''میں ابھی آرہا ہوں۔'' زندگی کا

یہ استہزا کیا افسانہ نہیں؟

گویا خدا اور اس کے تصوّر کے بعد پہلا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب آدم کے پہلو سے حوا برآمد کی گئی۔ دوسرا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب دو وجود، مرد یا عورت،

ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی ذات کو محسوس کرنے لگے اور
کہا۔ ”میں اور تو۔“ اور پھر وہ مسکرانے آبدیدہ ہونے

لگے۔ پھر اس میں ترنّم شامل ہو گیا، روشنی کی لپٹیں چلی آئیں۔ دونوں ایک
دوسرے میں کھو گئے ایک بچہ اس دنیا میں لائے جو انسان کا سب سے پہلا مختصر
افسانہ تھا۔ ”میں“ اور ”تو“ کے بعد بچہ ”وہ“ تھا۔

پھر اس افسانے میں، مدراس کی گھٹیا تصویروں کی طرح سے، خواہ مخواہ کی
پیچیدگیاں چلی آئیں۔ ایک اور بچہ چلا آیا۔ پہلا ہابیل تھا تو یہ قابیل۔ دونوں آپس
میں لڑنے لگے اور یوں ہی لڑتے جھگڑتے جوان ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو
مارنے مرنے پر تیار تھے۔ کبھی پیٹ کی خاطر اور کبھی عورت کے

لیے جو کہ ان کی اپنی ہی بہن تھی۔ آخر قابیل نے ہابیل کو جان سے مار دیا اور
یوں انسان کی اولاد ترقی کرنے لگی۔ آدم کے بیٹوں کے مرنے پر اس وقت کی
بزرگ عورت نے اپنے قبیلے کے جوان اور خوبصورت بیٹوں کو اپنا شوہر بنایا اور

بوڑھے کھوسٹ شوہر کو مار مار کر جنگلوں میں بھگا دیا۔ یہ شاید تیسرا یا چوتھا افسانہ تھا۔

پھر انسان نے فیصلہ کیا کہ ماں بیٹے یا بھائی بہن کی شادی بقائے نسل کے لیے اچھی بات نہیں۔ جب تک انسانی قافلہ مصر کے دیوتا "را" کی روشنی میں رعمسیس اوّل تک پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے ایسی شادی کی مناہی کے لیے قانون بنائے جو بہت بعد تک بھی لاگو نہ ہوئے لیکن آخر تسلّط پا گئے۔ انسانی بہتری کے دوسرے قانون اور افسانے جنم لینے لگے۔ پامپائی کی تباہی کے وقت ایڈیپس اور اس کی ماں علیحدہ ہو گئے۔ جب لوٹے تو ایڈیوس جوان ہو چکا تھا اور اپنی ماں کے بارے میں

کچھ نہ جانتا تھا جو روم میں رہ رہی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر ہمیشہ بہار رہتی ہے اور وقت جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ روم میں دونوں ملے اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور آخر شادی کر لی۔ کہتے ہیں کہ ان سے بڑا خوش خور پورے روم میں کہیں نہ تھا۔ لیکن ایک دن، ایک شام (شامت کا اسم تصغیر) انہیں پتا چل گیا کہ وہ ماں بیٹے ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ انسانی دودھ میں

سماجی تیزاب مل گیا اور وہ دونوں اس میں گھل گھل کر رہ گئے اور اس

ایک واقعے نے دنیا کے ہزاروں لاکھوں افسانوں کو جنم دیا جن میں انسانی فطرت اور اس کے اپنے بنائے ہوئے قانون میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پھر مشرق میں ایک اور عظیم افسانہ لکھا گیا جس کے کردار راجہ بھرتری ہری تھے اور ان کی رانی جو کہ ایک نہایت ہی حسین عورت تھی۔ بھرتری اس کے گداز جسم کی طرف دیکھتے اور سوچتے: کیا ایسا وقت بھی آئے گا جب اس کے چاند سے چہرے پر جھریاں چلی آئیں گی۔ چنانچہ کسی ولی نے انہیں ایک سیب دیا اور کہا "اس کے کھانے سے حسن لازوال ہو جاتا ہے اور انسان لافانی۔" بھرتری ہری نے رانی کے حسن کو دوام دینے کے لیے اپنے آپ پر اسے ترجیح دی۔ وہ اس حسینہ کو ہمیشہ اسی عالم عالمِ تاب میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن رانی ایک نوجوان دھوبی سے پیار کرتی تھی اور ہمیشہ اسے تندرست اور جوان دیکھنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے وہ سیب دھوبی کو دے دیا جو ایک طوائف پر عاشق تھا اور جو اس کی زندگی میں مسرت کے لمحے لاتی تھی۔ طوائف یہ سمجھ کر کہ اس کا جسم گناہ کی کان ہے وہ سیب

بھرتری ہری کی نذر کر دیا کیونکہ وہ حاکمِ وقت تھا اور اس کے دائم و قائم رہنے سے لاکھوں کروڑوں لوگوں کا بھلا اور طوائف کے اپنے گناہوں کا کفّارہ ہو سکتا تھا۔ بھرتری ہری نے دنیا ترک کر دی۔

اس کہانی میں کیا کہا گیا؟ کیا یہ کہ وہ شخص جسے ہم اچھا کہتے ہیں برا ہو سکتا ہے اور جسے برا کہتے ہیں اچھا؟ یا خالی خولی زندگی کا استہزا اور اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل؟ یا یہ کہ ہم کسی کے بدن پر قبضہ کر سکتے ہیں اس کی روح پر نہیں؟ شر نگار شتک کی عورت اپنے محبوب کے بازوؤں میں بوس و کنار کرتے ہوئے اپنے ذھن میں کسی دوسرے مرد کو رکھے ہوتی ہے!

چنانچہ پہلی کہانیوں میں اخلاق اور نتیجے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ آخر انسان نے سوچا کہ ہم بچے تو نہیں جو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے پھریں، اور یہ کہ کیا آدمی اس طرح کی نصیحت کو پلّو میں باندھتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے حقیقت میرے ہی تسلط میں آئی ہے؟ چنانچہ انہوں نے تدریس

کا کام درس گاہوں، تبلیغ کا مذہبی رہنماؤں کو سونپا اور سیدھی سادی کہانی سے اپنی اور دوسروں کی طبیعت خوش کرنے لگے؛ انسان کے جذبے، اس کی دلچسپی اور گھٹی میں پڑے ہوئے اس کے تحیّر سے فائدہ اٹھانے لگے۔ جہاں کہانی ان کے لیے تفریح کا سامان تھی وہاں ریاضی کا ایک سوال بھی جس کا حل عام عقل کے لوگ نہ جانتے تھے اور کہانی کہنے والا چہرے پر چمک لا کر ایک فتح مندی کے احساس سے سامنے دکھائی دینے والے متحیّر چہروں کا جائزہ لیتا تھا اور آخر اس کا انجام بتاتا تھا اور لوگ حیران ہو جاتے تھے۔ ایسا انجام تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کون سی کڑیاں تھیں جنہیں وہ سلسلے میں نہ لا سکے؟ کس داؤ پیچ نے انھیں مار گرایا؟ چونکہ بے وقوف اور فاترالعقل قرار دیے جانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس لیے کہانی میں سے Twist اور اس قسم کی چیزیں غائب ہونے لگیں اور کہانی کہنے والے کچھ اس انداز سے کہانی کہنے لگے:

"بھائی، میرے تجربے میں تو یہ بات آئی ہے، تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟" چنانچہ اس بے سروپا کہانی کا وجود ہوا جس نے آج تک رسالوں کے ایڈیٹروں کو پریشان

کر رکھا ہے۔ وہ یہی سوچتے رہتے ہیں: یہ اسکیچ ہوا یا کہانی؟ اور نہیں جانتے صحافیوں نے کہانی کا دامن کتنا وسیع کر دیا ہے کیوں کہ قتل کی اطلاعات کا من و عن بیان اور کچہری کی رپورٹ بھی کہانی ہے۔ لیکن اس بے سر وپائی کے باوجود کہانی لکھنے والے کی کہانی ایک صحافی کی کہانی سے یکسر بلند وبالا ہوتی ہے۔

کہانی کی کتنی بھی شکل بدل جائے، کہانی ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر نظم و نسق انسانی جسم کا حصّہ ہیں، وہ گا سکتا ھے اور ناچ سکتا ہے تو ہمیشہ کہانی کہہ سکتا ہے؛ واقعات کے بیان میں بڑھا سکتا ہے اور گھٹا سکتا ہے۔

اوائل کے افسانے کچھ یوں شروع ہوتے "ایک دفعہ کا ذکر ہے۔" ظاہر ہے کہ اس جملے کو ہم اب صرف بچوں پر استعمال کرتے ہیں۔ بڑے یہ فقرہ استعمال نہیں کرتے لیکن اس قسم کا تاثر برحق ہے۔ پھر "ایک دفعہ کا ذکر ہے مگدھ دیش میں ایک راجا تھا۔ اس کی سات رانیاں تھیں اور ساتوں کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک سادھو آیا اور اس نے سب سے چھوٹی رانی (جو کہ خوبصورت اور تر و تازہ تھی) کو ایک آم دیا اور کہا: "اسے کھاؤ گی تو اولاد پاؤ گی۔" رانی بہت خوش

ہوئی۔ اس نے سوچا میں نہا دھو کر اور صاف ستھری ہو کر آم کھاؤں گی اور اس دنیا سے بامراد جاؤں گی۔ چنانچہ آم کو طاق پر رکھ کر وہ غسل خانے میں نہانے گئی اور جب نہا کر لوٹی تو آم غائب تھا۔"

یہ عناصر آج کی "بے سر وپا" کہانی میں بھی ہیں۔ صرف راجا کی جگہ مزدور یا رانی کی جگہ کسی سوسائٹی گرل نے لے لی ہے۔ چونکہ محبت کے اظہار میں چند فقرے بار بار کہے گئے اس لیے اب ان کو کہنے کا انداز بدل گیا ہے۔ پہلے چہرہ ہمیشہ خوبصورت ہوا کرتا تھا، اب وہ قبول صورت ہو گیا ہے۔ کچھ حقیقت پسند یوں لکھتے ہوئے ہائے جاتے ہیں "وہ اچھی تھی اور نہ بری۔" لیکن اس میں جو بات کشش کا باعث ہو سکتی ہے اسے کہے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نفرت کا باعث ہو سکتی ہے اسے بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کوئی کتنا بھی پرانی کہانی سے بچنے کی کوشش کرے وہ اس کے بندھے ہوئے اصولوں سے بہت دور نہیں جا سکتا، ورنہ وہ کہانی نہ رہے گی۔ وہ موسیقی ہو سکے گی، نرتیہ ہو سکے گی، نقاشی ہو سکے گی لیکن کہانی نہیں۔ آپ کہانی کی اکائی کو دھائی میں بدل دیجیے لیکن اس بات سے انکار نہیں

کر سکتے کہ کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ میں آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے، انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے؛ اور جب کہانی کا ترنّم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی کو نہیں ڈھونڈیں گے کہانی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے آپ کو آ لے گی: اس عورت کی طرح، بچّہ اس دنیا میں لائے بغیر جس کا جینا بے معنی اور لا حاصل ہے!

راجندر سنگھ بیدی

بمبئی

ببّل

درباری لال، شام گھر ہی میں بیٹھا،سیتا کے ساتھ بیکار ہو رہا تھا۔ کسی کے ساتھ بیکار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک چھ بجے ارورا سنیما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہو گی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کاسنی ہو گا، لیکن۔۔۔

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہیشوری ادیان ہو گیا ہے۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن پیسے

کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنالئے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لئے جواب تک کھنچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کے ساتھی مہتا صاحب کے مکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے۔۔۔ ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ روپیہ اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے!

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی، جنہوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنایا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی نار، ایک لکھ پتی اسماعیلی صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلے پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو پریم کٹیر۔۔۔ اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منوتی ہو گئی۔ لڑکے کے رشتے دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری موہن یا صالح

محمد اپنا نام ہمیشہ ایس ایم نواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصہ نکالنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے درباری لال کے حواری جب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے، ”کیوں بے صالح۔۔۔؟“

آج صالح یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس سمے بہاری اور بھابی گن وتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں مثالی مرد اور مرد مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگے۔ درباری برآمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایکاایکی وہ لپکا اور اپنے منہ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا، ”میں درباری لال مہتا، ولد گردھاری لال مہتا، ساکن بمبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔۔۔“ سب اس آواز پر چونک گئے، عورتوں اور بچوں کی تو جان ہی نکل گئی۔ درباری لال واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق الٹنے لگا اور پھر اروراسنیما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اسے کاسنی رنگ کی ساڑھی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آ کر شامل ہو گئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پہ ہیئر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا۔ قینچی لے کر، آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے عمر کے اس حصّے میں لڑکے، لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی سی۔ پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں۔ درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں، یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے۔۔۔ بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل، بے قاعدہ اور کھردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چھپٹیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں۔۔۔ جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیص اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے، ایک دوسرے پر گرتے

پڑتے، ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجے کی طرف جارہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجادی، کھیل ختم کر دیا مگر سیتا نہ آئی۔۔۔

اروراسنیما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھیں اور جگالی کر رہی تھیں۔ پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جبھی ایک موٹی سی عورت آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک راما سوامی آرہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک راما سوامی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ تاہم یہاں درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے دھکیلتے، کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔

سیتا کی بجائے الٹی طرف سے مصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی گود میں بچہ تھا۔۔۔ ببّل! ببّل ایک تندرست بچہ تھا۔ گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے یوں تو کئی دانت نکال لئے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً

بڑے سے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا جو ببّل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببّل!" درباری نے پکارا اور ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیے۔ مسکراتے ہوئے ببّل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بس سی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری سے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو!" درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔ ببّل کے چہرے پر ایک پُرخلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببّل کی ماں، مصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس

نے ببّل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببّل ایک ریہرسل کئے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببّل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببّل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکاندار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی۔ ببّل روتا چلاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببّل اور اس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کرمرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟ کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دونی یا چونی مل جاتی تھی جس سے ببّل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرمرا چاہئے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دکاندار کو دیتی تھی۔ کرمرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پپولتے ہوئے ہمک ہمک کر اچھل اچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببّل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی بار

میں کر مرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری نے ببّل کو بہت روکا، پیار دلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گراہی جارہا تھا۔

درباری نے کہا۔ "کمینے۔۔۔ سالے۔۔۔" اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی، "کیا حکم ہے حضور؟"

"آپ کو عرض نہیں کیا، فیض گنجور۔" درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر ببّل کے پیارے دلارے سے گالوں پر چپت لگاتے اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا، "اتنا خود غرض۔۔۔؟ سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھنیہ واد۔۔۔ کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟"

مصری، فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم کو جس کے لے ایک تکلف بنادیا تھا، بے باکی سے بولی، "یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابو جی!" اور پھر ببّل کو چھاتی میں چھپاتی وہیں کھڑی وہ اپنی دونی یا چونی کا انتظار کرنے لگی۔ ببّل ہمیشہ کی طرح الف نہیں تو

اب ننگا ضرور تھا کیونکہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔ اس "لباس" میں خوش، ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے۔ پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لینے لگا، یورش سے پہلے ہی جس کے چھکے چھوٹ گئے۔ پھر ایکا ایکی، کسی پروں والے، خیالی گھوڑے پر بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر۔۔۔ اور منزلیں تسخیر ہو ہو کر اس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں۔

مصری ایک پکے بلکہ کالے رنگ کی جوان عورت تھی اور ببّل گورا چٹا۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟ درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے عوض ببّل دے گیا ہو گا۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے، بابو جی۔ ورنہ یہ ہل کٹ۔۔ کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔"

"کیوں، کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالوم نہیں۔" مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے ببّل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی، "ہاں عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے۔"

درباری جی کھول کے ہنسا، "بدمعاش ہے نا۔۔۔ ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟" مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی گود میں ان گنت گوپیوں والے کنہیا کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے ببّل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے ارد گرد ناچ رہی تھیں۔۔۔ ببّل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ! درباری نے جو مصری بائی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا، "اس کا باپ کیا کرتا ہے،

مصری؟"

"اس کا باپ۔۔۔؟" مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا، "نہیں ہے۔"

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھی کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی، "ایک بار وہ پھر آیا تھا۔۔۔ مجھے یوں ہی لگا، جیسے۔۔۔ وہی ہے۔ لیکن۔۔۔ میں کیا کہہ سکتی تھی، بابو جی۔۔۔؟ میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔۔۔ جب تک میں نے اس بچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا۔۔۔ ببّل۔۔۔! جب سے میں نے اس کا نام ببّل رکھ دیا ہے۔۔۔"

اور مصری پھر سوچنے لگی، "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟" درباری بھی سوچنے لگا، "ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں۔۔۔ پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ

ہو۔" درباری نے آج اٹھنی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے ببّل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ببّل نے سکے کو ہاتھ میں لیا، زور زور سے بازو کو ہمکایا اور پھر اسے پھینک دیا۔ اٹھنی سڑک پر کے مین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو ایک خشک، بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے اسے روک لیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنی اٹھائی اور ببّل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی، "لچا ہے نا۔۔۔" اور پھر اسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی، "سچ پوچھو، بابو جی! تو میر امر د یہی ہے۔"

"تیر امرد۔۔۔؟"

"ہاں!" مصری نے ببّل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی، "یہ کماتا ہے، میں کھاتی ہوں۔"

مصری بہت باتونی تھی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی۔ ببّل اور بھی کر مر امانگتا لیکن درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی

سے مصری کے آبنوسی حسن اور ببّل کی گوری چٹی معصومیت کو جھٹک دیا اور "میں چلا، صالح بھائی۔۔۔ اچھا بھائی" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑے سے ہوئے دکھائی دیے، جنہیں درباری نے جھک کر باہر نکالا اور سیتا کے پاس جا پہنچا۔

شیواجی پارک میں 'سمندر کے کنارے' کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ سیتا اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں کچھمن دئی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے "رباب" سے کرایہ اگاہے تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑیا دکھائی دیتا ہے، بھاگ جائے۔۔۔ اور جینا سکھی ہو جائے۔ کچھمن دئی سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شک اور وسوسے کا اظہار کرنے لگی۔

لیکن جب اسے پتہ چلا، درباری کا پورانام درباری لال مہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئی میں جو لوگ مکانوں کا کرایہ اگاہتے ہیں، انہیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی بے خود سی سیٹی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اِس کا پاس آنے ہی سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لئے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے، یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔ ہاں، سیتا کے بال بہت لمبے تھے جن کے کارن درباری اسے پوچھا کرتا، ”تمہارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟ اور سیتا کہتی، ”میں خود جو ہوں بنگالن۔۔۔ میرا نام سیتا موجمدار ہے۔۔۔“

درباری کہتا، ”سیتا مزے دار۔“ اور سیتا ہنسنے لگتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا قد صرف

اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی روح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے۔

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے منہ کے پاس کرتے ہوئے بولی، "دیکھو۔۔۔ میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں؟"

"کیا لائی ہے؟" درباری نے پوچھا اور ان جانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔ سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی، "ایسے نہیں۔۔۔ میں خود دکھاؤں گی۔" اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی، "سونگھو۔"

شامت اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔ محبت کا سارا کھیل رک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی ہنستی جا رہی تھی۔

"یہ۔۔۔" درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا، "کیا مذاق ہے؟"سیتا کہنے لگی، "تم اسے مذاق کہتے ہو۔۔۔؟ بیس روپے تولہ کی نسوار ہے۔"

"نسوار؟"

"ہاں!"سیتا بولی، "تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔"

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی، "یاد ہے پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟"

"یاد نہیں۔" درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا، "صرف اتنا ہی پتہ ہے، تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا۔"

”وہاں۔۔۔“سیتا نے سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”تم نہارہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی ادھر جا نکلیں۔۔۔“

”ادھر کیوں؟“

”یونہی۔“سیتا نے کہا، ”چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے؟ ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ پھر ہوتا ہواتا تو کچھ نہیں، جبھی پتہ چلتا ہے۔۔۔ کوکا کولا پی رہی ہیں!“سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی، ”ہم سب تمہاری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیونکہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے فوّارے تک اور فوّارے سے کنارے تک آ جارہے تھے اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دہرے تہرے ہوئے جاتے تھے۔۔۔ بچے کی طرح میرا جی چاہا، بھاگ کے تمہیں پکڑ لوں اور پلو سے تمہارا منہ تمہاری ناک پونچھوں اور پیچھے

ایک چپت لگا کے کہوں، ''اب جاؤ مزے اڑاؤ۔۔۔''

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ ''دوسری لڑکیاں کون تھیں؟''

''ایک تو کمد تھی۔'' سیتا بولی، ''دوسری جولی۔۔۔ وہاں، کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے پاس رہتی ہے۔ تیسری۔۔۔'' اور پھر ایکا ایکی رکتے ہوئے کہنے لگی، ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایسے ہی۔'' درباری نے جواب دیا، ''تمہاری سہیلیاں تمہاری جوتی کی بھی ریس نہیں کرتیں۔''

''تم نے دیکھی ہیں؟''

''دیکھی تو نہیں۔''

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھل اٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پہ پر تولے لیکن رک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا، ''آج دن ڈوبتا ہی

نہیں۔"

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار پتّل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خودے لا رہی تھیں۔ پھر بیچ میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے جو دور اندر دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے سمندر میں پھینک دیے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل ریتے پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصّے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا۔ سیتا نے مڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھٹ رہے تھے۔۔۔

دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دنیا کے دونوں کناروں سے سمیٹے اور انہیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، کیسری رنگ کی گٹھری سی بنا، دور پچھم کے گہرے گہرے پانیوں میں اترنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی

تھی جو آسمان پر کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔لو اب تمہارا راج ہے۔ جاؤ، موج اڑاؤ۔۔۔

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی وار میں اس کے قریب بھی لے آئی۔۔۔سیتا کانپنے لگی، درباری ہانپنے لگا۔۔۔ اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پول اور کلب اور سڑک پر کے قمقمے تو ایک طرف، پھیری والوں کے جھابوں اور ٹھیلوں پر ٹمٹمانے والے دیے بھی لرزنے لگے۔ جبھی جیسے دیوار میں سے آواز آئی، "درباری! کیا کرتے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے۔۔۔" درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا، "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔"

"پیار کا مطلب۔۔۔ یہ تھوڑے ہوتا ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔۔۔" اور درباری اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک

کر کے جانے لگا۔سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی اور التجا آمیز لہجے میں بولی،
"کیا کر رہے ہو، چاند۔۔۔؟" اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے
لپٹ گئی جو غصے سے ہانپ رہا تھا۔ درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھرا
لئے اور بولا،Bitch"۔۔۔بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے۔۔۔۔"

"میں کچھ نہیں سمجھتی۔"سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو
پکڑتے ہوئے کہا، "میں تمہاری ہوں، چندا۔۔۔ نس نس، پور پور تمہاری ہوں۔
پر میں، ایک بدھوا ماں کی بیٹی ہوں۔۔۔ مجھ سے شادی کرلو، پھر۔۔۔"

"کوئی شادی وادی نہیں۔۔۔" درباری بولا، "تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟
کیا منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟" اور
درباری لال رک گیا جیسے اب بھی اسے امید تھی۔۔۔

"ہاں ضروری ہے۔"سیتا روتے ہوئے بولی، "یہ دنیا میں نے، تم نے نہیں بنائی۔"

درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا، "میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس میں پیچ

کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سویم بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے۔"

"لکھا ہوگا۔۔۔" سیتا بولی، "سب تمہاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے۔۔۔"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" درباری نے غصے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے اور پھر وہ انہیں کھینچتے، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔ سیتا پیچھے لپکی، "سنو۔۔۔" ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے کو گلے لگا سکتے تھے۔ ایک دو لڑکے فضا میں تعجب دیکھ کر رک گئے۔ پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ، سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر رکھ دیں اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی۔ درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی، ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اٹھ کر

درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی، ”تم سمجھتے ہو، میں کسی برف، کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھل مل جانے کو جی نہیں چاہتا؟ تم مجھ سے لگتے ہو تو کیا میرا انگ ٹوٹنے، دکھنے لگتا؟ پر تم کیا جانو، ایک لڑکی کے دکھ۔۔۔“ اور پھر کسی ان جانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی، ”میں نہیں کہتی یہ دکھ تم نے دیے ہیں۔ یہ بھگوان نے دیے ہیں۔ بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔۔۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ”مرد سب سہ سکتا ہے توہین نہیں سہ سکتا۔“

”کس کی توہین؟“

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری۔ خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا۔

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی

چھاتی میں منھ میں چھپا کر وہ سب بھول گئی تھی جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دکھ درد دور ہو گئے تھے۔۔۔ وہیں ریت پر پڑی پڑی سیتا دبی ہوئی سسکیاں لیتی رہی۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لئے تو نہیں آ رہا۔ جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لئے کوئی نہ کوئی بانکا ضرور چلا آتا ہے۔۔۔ سامنے دیے کی لو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب۔۔۔ اس میں ریت چلی آئی تھی۔۔۔

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار کرتا تھا، لیکن اتنا نہیں، جتنا سیتا کرتی تھی۔ سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لئے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کہ کوئی اوپر سے سندیسے میں انگوٹھی پھینکے۔۔۔ لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک بیچ میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اب تو انگریزی "فن" چلا آیا تھا، جس سے درباری پورا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا۔ صاف سُتھرے بر آمدے میں بیٹھے ہوئے درباری خالی خولی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا، جہاں کبھی کاسنی اور کبھی سردئی، کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھانجا محمود دیا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بدوضع کھلونے سے کھیل رہا تھا، جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لئے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا۔ بچہ رونے لگے، مچلنے لگا۔

"ہے ہے۔۔۔" درباری نے احتجاج کیا، "کیا کر رہی ہو آپا؟"

"تم چپ رہو جی۔۔۔" وہ بولی، "تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو۔۔۔ دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟"

"اچھا جی!" درباری بولا، "اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا

ہے۔۔۔ ایسے تو لارڈ کچنر بھی پورا بیڑا ڈوب جانے پر نہیں رویا ہو گا۔۔۔ دوا سے کھلونا۔“

”کیسے دوں۔۔۔؟ کہیں آنکھ پھوڑ لے۔۔۔“

”سب بچے الٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟“

”جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟“

”سب ماؤں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے۔“

اور محمود دیا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنا اور قلابازیاں لگانا شروع کر دیتی تھی، جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا، بڑے بھی محظوظ ہونے لگتے تھے لیکن بچوں کو تو وہی کھلونا چاہئے جو کسی نے چھینا ہے۔ درباری نے برے برے منہ بنائے، کیسے کیسے خو خو، خا خا کیا، منہ میں انگلی ڈال کر ہنومان بنا۔ پھر جانی

واکر، آغا۔۔۔ لیکن وہ رو رہا تھا۔ اسے اپنا وہی کھلونا چاہئے تھا۔ درباری کا جی چاہا، اسے تھپڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلا کر کہا، ''اب بند بھی کر، سالے۔۔۔''

اندر سے آواز آئی، ''رونے دے یار۔'' بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، الٹے پیروں۔

''ہے رام۔''

''ہائے اللہ کیوں نہیں کہتیں؟''

''بھگوان کے لیے۔۔۔ تم چپ رہو۔''

''خدا کے لئے کہو تو۔۔''

پھر ستونتی یا کنیز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی، ''لے میرے باپ۔'' اس نے کھلونے کو بچے کو ہاتھ میں ٹھونستے ہوئے کہا اور پھر جیسے

اس کی حالت زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، ہلورے دیے۔ قمیص سے اس کا منھ پونچھا، ناک صاف کی۔ چوما، چاٹا۔۔۔ اور اس کے کہے کے مطابق "بڑی ٹھنڈ پڑی۔۔۔" پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں، "ہائے مر جائے ایسی ماں۔۔۔ نہ رہے اس دنیا میں، لال کو کتنا رلایا ہے۔" اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی، "دیکھو تو کیا مزے سے بیٹھے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے!

درباری بولا، "اب چاہے ہاتھ نہیں، گردن بھی کاٹ لے۔"

"کاٹ لے۔" دیدی بولی، "مروں گی میں۔۔۔ تم لوگوں کو اتنا سا بھی وہ نہ ہو گا۔"

"ہو گا یا نہیں۔۔۔" درباری بولا، "کہتے ہیں۔۔۔ نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا کرتا ہے، لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد۔۔۔ پہلے ہی چھیننے کی بے وقوفی نہ کی ہوتی۔"

"ہاں، میں بے وقوف ہوں۔" دیدی کہتی ہوئی بچے کو اندر لے گئی، "ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا الگ باتیں ہیں۔"

جبھی سامنے اروراسنیما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سارنگ دو تین بار لہرایا۔ درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کیئے، سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا۔ موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔

"کہیے حضور۔۔۔ کیا حکم ہے؟" درباری نے پوچھا۔سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو۔ درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا، "اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر۔۔۔" اور وہ لوٹنے لگا۔

"سنو!"سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی، "مجھے شما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔" درباری نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ "اب تو نہیں ہو گی؟"سیتا نے نفی

میں سر ہلا دیا۔

"جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟"

سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منہ پرے کرتی ہوئی ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھُردرے سے ہاتھ پھیلائے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا، "تو تو ایسے ہی ڈر رہی ہے سیتے۔۔۔! تجھے دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں بڑا اینچ ہوں۔"

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی۔ بولی، "نہیں۔۔۔ ایسا کیوں؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیوا جی پارک میں، دیوار کے نیچے۔۔۔ دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر منعکس ہونے والی روشنی کو ادھر زمین پر پھینک دے۔ اس لئے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپک لیا۔ سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کے ارد گرد بنے

ہوئے جنگلے، خاک کے بنے اور پھر معدوم ہو گئے۔ درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے سیتا منفعل سی بیٹھی رہی۔ درباری ایک دم جھلا اٹھا اور بولا، ”کچھ ہنسو، بولو بھی نا۔۔۔“ سیتا کو ہنسنا پڑا۔ درباری نے سیتا کی کھو کھلی ہنسی کی نقل اتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی۔ درباری حوصلہ پا کر بولا، ”تمہیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواس نہیں؟“

”یہ بات نہیں۔“ سیتا بولی، ”تم مجھ سے شادی کر بھی لو گے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ سمجھو گے، میں ایسی ہی تھی۔۔۔“

”نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا۔۔۔ کبھی نہیں سمجھوں گا۔“

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لئے چلے آئے۔ درباری چونکا۔ اس کی تسلی ہوئی جب انہوں نے سلاخیں ریتے میں مارنی شروع کر دیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انہوں نے ریتے میں دبایا ہو گا اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے بر آمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ مڑ

کر دیکھاتو دیوار کے اوپر، بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی، لجا رہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے ''اسے مرے دل کہیں۔۔۔'' گاتے ہوئے پاس سے گزرے۔ پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری جھلا کر اٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے ارد گرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی اور بولا، ''چلو سیتے، جوہو چلیں گے۔''

''جوہو۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ اٹھو، کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔'' سیتا چپ چاپ اٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ پر ادھر ادھر پھر نہ سکتے تھے، کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا۔ چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو بحر زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔ لیکن اس دن جوہو کے سب ہوٹل، سب کاٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا، بے تعلق۔ زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منھ میں رکھ لی ہو، جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تاردیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی روڈ پر جا پہنچی، جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا، ”کوئی کمرہ ہے؟“ منیجر نے غور سے درباری کی طرف دیکھا، جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کر کے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی زمین کی طرف دیکھتے

ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ جبھی منیجر نے پوچھا، ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”جی؟“ درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا، ”اورنگ آباد سے۔“

”خوب!“ منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”آپ کا سامان کہاں ہے؟“

”جی سامان تو نہیں ہے۔“

”معاف کیجئے۔“ منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نجس اور لجلجی شے ہو اور بولا، ”اپنے پاس کوئی روم نہیں۔“

”کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلی فون پر۔۔۔؟“

بیرا نمبر ۷ ۲ جو ایک ٹرے پر ویفر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لے

کر جارہا تھا، بول پڑا، ''یہ ہوٹل عزت والے لوگوں کے لئے ہے صاحب''!

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیرے کا ٹپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ منیجر صاحب کی عزت پانچ روپے سے۔۔۔ اور آج یہ سب کے سب ایک دم نیکی اور عزت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے۔ وہ عزت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کر گزرنے کے لئے مشاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے مدمقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے۔ درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا۔۔۔ وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں۔ جنہیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی۔

''چلو سیتا۔'' درباری نے کہا، ''پھر کبھی سہی۔'' اور دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیے۔ زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو

کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہو گئے اور بہت سے ہیرو پیروں میں آ گرے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا سا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ۔۔۔ یا تو پیدا ہی نہ ہوتی۔ اسی لئے بڑے، خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی اولاد کی طرح انہیں جھٹک نہیں سکتے، ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیونکہ ہر دو صورتوں میں سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آ لیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، بالکل بے دست و پا۔۔۔ غسل دی جانے والی میت کی طرح۔

درباری اس وقت برآمدے میں بیٹھا ڈان باسکو دیوار کے ساتھ اگے ہوئے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن کی چھاؤں میں محلے کے امراء کی موٹریں سستا رہی

تھیں۔ کچھ تو یہ ان امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے ان کی پوری تسلی ہو جاتی تھی اور کچھ ایسے لوگوں کی جنہوں نے انہیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈرائیوروں کو سر شام گاڑی چمکانے اور منہ سی رکھنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی۔ یہ بیرا نمبر ۲۸ تھے۔

درباری نے کھینچ کھانچ کر اس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا، کار میں افزائش پانے والی امید سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے؟ باپ گردھاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے۔ اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا۔

صالح بھائی یا سرداری لال مع اپنے بیوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پیچھے ٹھنٹ سے بازوؤں والی بے بچہ بھابی رہ گئی تھی، جس کی بھیا سے بچہ نہ ہو سکنے پر تکرار ہی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی تم میں نقص ہے اور وہ کہتے تم میں۔ وہ کہتی تم ڈاکٹر کو دکھاؤ، وہ کہتے تم اپنا معائنہ کراؤ اور ناپید بچے مایوسی سے انہیں دیکھتے رہتے

اور اپنا سر پیٹ لیتے۔

درباری مکمل طور پر بور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے گا تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں کچھ دن تو زندگی دیکھ لے۔ آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے۔۔۔ کس کے ساتھ شادی؟ سیتا لپک کر اس کے دماغ میں آتی تھی۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی، لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں۔ وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی، شکل صورت سے بھی بری نہ تھی لیکن بیوی۔۔۔ بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہئے۔ ادھر ادھر جھانکنا چاہئے تا کہ مرد کان سے پکڑ کر کہے، "ادھر۔" اور پھر بدھوا کی بیٹی؟ مرد سے یوں چمٹتی ہے جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔۔۔ میں کہاں کر ایسے اگاہتا پھروں گا؟ ہاں تھوڑی دیر کے پیار کے لئے سیتا سے اچھی کوئی نہیں۔ کیا جسم پایا ہے!

جبھی مصری دکھائی دی اور ببّل دکھائی دیا۔۔۔ مصری دور ہی سے "بابو جی" کی طرف انگلی کرتی ہوئی آ رہی تھی اور ببّل وہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا

ہمک رہا تھا۔ پھر یکایک ببّل میں زندگی اچھلی، جیسے گیند زمین پر سے اچھلتا ہے اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ آج ببّل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ ایک میلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ ہاں، نیچے اللہ ہی اللہ تھا۔ پاس آتے ہی ببّل نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

"کمینہ! جیسے میں اس کے لئے کرمرا لیے ہی تو کھڑا ہوں۔۔۔" جیسے اندر جانا اور باہر آ کر اس کے حضور باج گذاری اس کے صبر کی آخری حد ہے۔ درباری کرمرا لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا۔۔۔ مصری ایک عورت ہے، اور ببّل اس کا بچہ۔ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر 'محض تکلف کی چیز۔' جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آ جاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرمرا ببّل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا بات تھی جو آج درباری ببّل کو گود میں نہیں لے رہا تھا۔ جیسے وہ شرما رہا تھا۔ لیکن وہ ربڑ کی گیند۔۔۔ ببّل۔۔۔ جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر

پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے کرمرا نہیں چاہئے تھا۔ اسے کرمرا بھی چاہئے تھا اور آسمان کی بادشاہت بھی۔ ببّل حیران ہو رہا تھا۔۔ آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

"آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصری؟" درباری نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی چودہ آنے۔"

"کیوں، صرف چودہ آنے کیوں؟"

"آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا۔" مصری نے بے باکی سے کہا۔

"تیرا مرد؟" درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا، "تم نے کوئی مرد کرلیا ہے؟"

مصری ہنسی اور ببّل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی، "یہ ہے میرا مرد، میرا کماؤ مرد۔۔۔ اسے آج اس کی موسی پارلے کی چونا بھٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان دی، جو یہ ہل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں

کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا۔" درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ ببّل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور ببّل کر مرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا۔ مصری بولی، "ننگا رہنے والی عادت پڑ گئی تو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے، مصری۔"

ببّل جیسے ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا، "جھوٹ۔۔۔! اچھا لگتا ہوں تو پھر مجھے لیتے کیوں نہیں؟" اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا، "ہو، ہو، ہو۔۔۔"

"ببّل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو؟" درباری نے پوچھا۔

"یہ؟" مصری ببّل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے، "یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی۔۔۔" درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا بابو جی؟" وہ بولی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

"تم لو نا۔" درباری بولا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا، "جلدی سے لے لو، نہیں کوئی دیکھ لے گا۔" مصری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب تک اس کا چہرہ قرمزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنے نیفے میں اڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جو اب وہ سال میں مشکل سے تین چار بار سنتی تھی۔ لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اس نے درباری کی بات سنی، "تم تو جانتی ہو، مصری!" درباری بولا، "میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔۔۔ ببّل سے۔۔۔ اگر تم اسے ایک دن کے لئے مجھے دے دو۔۔۔" مصری کچھ نہ سمجھی۔ درباری نے کہا، "میں اسے کلیجے سے لگا کے رکھوں گا، مصری۔۔۔ ایک ماں کی طرح، تمہاری طرح یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے، اتنا اچھا لگتا ہے کہ۔۔۔ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔" اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر ببّل کو لے لیا۔

ببّل ایک دم خوشی سے اچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ کرمروں کے لئے گردن کو یوں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھماتا ہے۔۔۔ پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائیکل کی

طرح سے چلنے لگے۔ درباری نے کرمرے کے کچھ دانے ببّل کے منہ میں ڈالے۔ جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اتار دو۔ کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو۔ بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا، ہنسا بھی لیکن منھ درباری کی طرف کر لیا۔ ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔ مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کہیں آپ کے کپڑے خراب کر دیے تو؟"

"تو کیا ہوا؟" درباری نے کہا، "بچوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔" مصری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا، زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کے لئے اسے مرد مل گیا۔ اب اس نے سوچا میرے بچے کا باپ مل گیا اور پہلی چیز سے دوسری بہت بڑی تھی۔

”میں اسے کھلاؤں گا، پلاؤں گا، مصری۔“ درباری نے وعدہ کیا، ”تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا۔“

”اچھا۔۔۔“ مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی۔ پھر رک گئی۔ مُڑ کر بچے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا اور اپنے ارد گرد درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے نہ کھلنے پر جھلا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی، ببّل نے دیکھا بھی، مگر اسے آج کسی بات کی پروانہ تھی۔ باپ کی پروانہ تھی تو ماں کی بھی نہیں۔ مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی اور جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ببّل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

درباری ببّل کو لئے اندر آیا۔ ببّل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو

گئی۔ ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ ہر شئے کو وہ منھ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی۔ ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی، ''ہائے رام، یہ کیا؟''

''ببّل، ماں! مصری کا بیٹا۔'' درباری بولا، ''مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔''

''اس کی ماں کہاں ہے؟''

''گئی۔۔۔ میں نے تھوڑی دیر کھیلنے کو لے لیا ہے، ادھار۔۔۔ ایک بار پیدا کر دیا، پھر ماں کا کیا کام؟'' درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جارے جا۔'' ماں بولی، ''چھ آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے۔ پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں۔''

''اچھا ماں۔'' درباری نے کہا، ''میں اسے پوار کالج کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگ موہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں۔ تو ذرا اسے

پکڑ۔" ماں نے جھر جھری لی، "ہا۔۔۔گندا۔" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی، "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاتی۔" بھابی جو کچھ دیر پہلے آ کھڑی ہوئی تھی، بولی، "اتنا ہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے؟ شادی کر لیتے؟"

"نہیں۔" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا، "مجھے دوسروں ہی کے اچھے لگتے ہیں۔"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی، "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببّل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببّل چمچے کو منہ میں ڈالتا، چُوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا۔ ایکا ایکی ببّل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں، پھر بھابی کی طرف پھیلا دیے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر جیسے اندر کے کسی ابال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببّل کو اٹھا لیا۔ اور اسے سینے

سے لگا کر ملنے لگی، جیسے کسی اپار سکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببّل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببّل کو نہلا دھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سیکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بنا ڈالے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اس کے لئے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی۔

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اوپر کچھ کتابیں۔ پھر دھپ سے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی کی طرف اڈا۔ بیٹھک میں پہنچا تو ببّل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سر دیے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے منہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل جانے کس جذبے، کس گنتی سے اس نے اپنے پورے پر درباری کی طرف پھیلا دیے۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببّل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور "اچھا بھابی۔۔۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر، ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے درباری نے ببّل کے لئے ایک قمیص

خریدی اور ساتھ ایک نکّر بھی۔ قمیص تو جیسے تیسے ببّل نے پہن لی لیکن نکّر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا، برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا۔ ابھی ہمکا، پھر گرا۔ درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر منھ اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ عجیب آدمی ہو، ایک بچہ بھی پکڑنا نہیں آتا۔

پھر ایکا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اوپر کی طرف ہمکا۔ بجلی کے ڈر سے درباری نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ ببّل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی، دکاندار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا، نہیں تو جناب کی انگلی اڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور پھر دکاندار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ اس نے مجھے مارا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببّل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نکّر کی وجہ سے تکلف ہو رہی

تھی۔ وہ ”زندگی بھر“ یوں کسانہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلے کی طرح اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ نہیں مجھے لے کر چلو۔۔۔ بازار میں، جہاں لوگ آجا رہے تھے۔ پھر اس نے زور سے اوپر نیچے ہو کر آخر نکّر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چر رمرر کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی۔ اور اب۔۔۔ نِکّر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا!

درباری جب سیتا کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھادیوی میں کمد سے ملنے گئی ہے۔ پربھادیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمد کے گھر کا کیسے پتہ چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی۔۔۔ کیوں کام کیا ہے؟ اس لئے خاموش ہی رہنا اچھا تھا۔ اس پر ایک اور مصیبت۔۔۔ ماں بتانے لگی، پہلے مالے پہ رہنے والے سندھی نے ”نوسٹ“ دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی

بوڑھی باتیں سنتا رہا اور بتاتا رہا یہ ببّل اس کا بھانجا ہے۔ بڑا پیارا دلارا بچہ ہے لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا۔ کیوں رے؟ ببّل نے جواب بھی دیا، لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔

ببّل کو ماں کی بولی معلوم تھی۔ لیکن ماں ببّل کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے بیٹھی، "کمیٹی کہتی ہے، ہر سال اتنے پیسے مرمت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کروائے۔ کیا کیا کانون پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار توڈوبنے کو آئی ہے۔ اشٹ گرہی میں کیا ہو گا؟ میں تو جگادھری مائیکے لوٹ جاتی ہوں۔۔۔ تم شادی کب کرو گے؟" کوئی ہی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں، ماں بور ہو گئی۔ بولی، "سیتا پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔"

"میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی۔۔۔"

"کدھر جا رہے ہو؟"

”شہر کی طرف۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماں بولی، ”وہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے۔۔۔ ہنڈولے آ رہے ہیں نا، مجھے مولی خریدنی ہے۔ مولی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟“ درباری سٹپٹا کر رہ گیا۔ ببّل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا، ”چلو ماں جی، میں آپ کو پریل چھوڑ دوں۔ راستے میں کمد کا گھر ہے نا؟“

”ہے تو۔“ ماں اٹھتے ہوئے بولی، ”پر آگ لگے۔۔۔ یہ بازار بمبئی کے۔۔۔ بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی۔۔۔“

”چلو، اکیسویں بار بھی بھول جانا۔“

”پر تم۔۔۔ سیتا کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟“

”دیدی کے پاس۔۔۔ کہانا۔“

"سنا ہے وہ مسلمان ہے؟"

"کیا بات کرتی ہیں، ماں جی؟" درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو تھام لیا۔ ستونتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر مسلط ہو جائے، سیتا چلی آئی۔ بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لیے۔ اس نے آئرن گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بیگمی چاولوں کے کلر کی سی ہینڈلوم ساری لپیٹ رکھی تھی، جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کے لئے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے۔۔۔ اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر، آپس میں ٹکرانے، دل کو دھڑکانے لگے۔ سیتا نے آتے ہی پہلے ببّل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں، "کس کا بچہ ہے؟" اور پھر لپک کر بچے کے پاس جا پہنچی، "ہے، کتنا پیارا ہے، ببلو سا۔"

”ہاں!“ درباری نے کہا، ”ببّل ہی اس کا نام ہے، تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”مجھے کیا معلوم؟“سیتا نے تالی بجاتے ببّل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا، ”ہر بچے کی شکل سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ تمہیں نہیں چلتا؟“

ببّل نے پہلے شک و شبہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دیے۔سیتا نے اسے اٹھا لیا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببّل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور ”او۔۔۔ او۔۔۔“ کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، اس میں کچھ ہے، میرے لئے؟ درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سیجیں تھیں اور بچے۔ شاید ببّل سیتا کی آنکھوں میں سے منعکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اتاولے ہو کر کہا۔ ”گھنٹہ بھر سے میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں، دیدی نے بُلوایا ہے۔“

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا، "ماں۔۔۔؟"

"ہاں بیٹا۔" ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔۔۔ میں اس کے لئے کچھ بسکٹ۔۔۔"

درباری نے اور بے صبری سے کہا، "ہوتے رہیں گے، تم چلو۔۔۔ میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے۔۔۔" اور سیتا ببّل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئے، "اے تو تو تھوتا سا، موتا سا، گوتا سا ببلو ہے۔۔۔" اور سیتا دل میں اتنا سا بھی وسوسہ لیے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی، "اس میں چلیں گے؟" درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببّل اور سیتا اور آخر درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی۔۔۔ ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گذری، "یہ سوٹ کیس۔۔۔؟"

"ہاں!" درباری نے کہا۔

"دیدی کے ہاں جارہے ہو؟"

"کہیں بھی جارہا ہوں، تمہیں اس سے کیا؟" اور پھر ایک خشمناک نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا، "تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے جاؤں گی۔" سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس۔۔۔ بچہ۔۔۔ اس نے ڈر کے عالم میں ببّل کو سیٹ پر بٹھا دیا اور نتھنے پھلاتی ہوئی بولی، "ہاں، کہا تھا۔" سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرا لیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے خمار آلود نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا، "سیتا! تم پھر لگی ہو، اس دن کی طرح کرنے۔" سیتا ڈر گئی، "نہیں تو۔" وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جارہی تھی۔ آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مون سون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا کچیلا، گندہ اور گیلا۔۔۔ شاید دور کہیں برسات شروع ہو چکی تھی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑرہی تھیں۔۔۔ پھر وہی سفر۔۔۔ تار دیو، اوپرا ہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین۔۔۔ اور ایک

ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ اس دن گئے تھے۔ سامنے ایک بیرا کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببّل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزت، بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اترا۔ ٹیکسی والے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اتارنے کا اشارہ کیا۔۔۔سیتا اتری۔ اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببّل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اسے کچھ تامل ہو رہا تھا۔

''اٹھاؤ نا۔۔'' درباری نے ببّل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بچہ ہمیشہ عورت اٹھاتی ہے۔'' سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببّل کی طرف دیکھا جیسے وہ ابھی اسے اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببّل کو اٹھا تو لیا لیکن اس سے پیار نہ کر سکتی تھی۔۔۔ اسے کچی کچی، کھٹی کھٹی، گندی گندی ڈکار سی آنے لگی تھیں۔ ہوٹل اوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا۔۔۔ کمرہ ہے۔۔۔؟ اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔ سیتا نے دیکھا۔۔۔ سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور

گھی کے ڈرم کے ڈرم لڑھکا دیے ہیں۔ رسہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ ہو رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دینی کی بو آ رہی تھی۔ رسے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

منیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک چلی آئی۔ وہ عجلت سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا، "ویلکم سر۔۔۔" آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے۔ درباری نے منیجر سے کہا، ہم بلی مور سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ رات گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے۔ جہاں تاج محل دیکھیں گے جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لئے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جرم کا احساس تھا۔ کیونکہ اس سے اس نے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کئے تھے۔ اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا۔۔۔ پر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ منیجر "سر، سر" کرتا رہا۔

ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا۔۔۔ سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجالاتا۔ رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد درباری کمرے میں پہنچا تو ببّل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔

"یہ کس نے دیے؟"

"بیرے نے۔"سیتا بولی۔

"اور یہ۔۔۔ آئس کریم کی کون؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے۔"

اور بیرا بچے کے لئے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا۔۔۔ جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا اور آج ایکا ایکی اسے کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی۔ جس کے سامنے ٹپس کی آمدنی اور پکار کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ یوں کھڑا تھا، جیسے وہ کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے۔ وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا۔

"اچھا بیرا۔۔۔" درباری نے بے رحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا، "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو نا، کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے۔"

"جی؟" بیرا بولا، "میری جرورت پڑے صاحب۔۔۔" درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببّل کو دودھ پلانا برا لگ رہا تھا لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو برا لگتا، بہت ہی برا۔۔۔ جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببّل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا۔

"ہائے! گندا کہیں کا۔" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منھ پونچھنے اور پھر جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی۔ ببّل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی، درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ ہوٹل کوئی اتنا اچھا نہیں۔" وہ یونہی سی کوئی بات کرنے کے لئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔" سیتا بے پروائی سے بولی۔ پھر درباری نے ناک سکوڑ کر ادھر ادھر

سونگھا اور کہنے لگا، ”کوئی بو سی آ رہی ہے۔۔۔“ اور پھر اس نے پسینے کے قطرے اپنے ماتھے پر سے پونچھ ڈالے اور بولا، ”تم اب اسے چھوڑو بھی۔“سیتا نے ببّل کو بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلا ہو گیا۔ درباری نے ایک ایش ٹرے ببّل کے پاس لا رکھی اور ببّل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا۔۔۔ وہ کیا کرتا؟ پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے، بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھگوان کے لئے۔۔۔“سیتا بولی اور اس نے ببّل کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن درباری کی آنکھوں پر جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی، اسے کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تر و تازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں کھبے جا رہے تھے۔سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ آج وہ خود بھی بے سہارا ہو جانا

چاہتی تھی۔

ببّل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا، ”وہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔“

”میں تم سے پیار نہیں کرتی۔۔۔؟میں تم سے۔۔۔“

ببّل نے ایش ٹرے کی راکھ منہ پر مل لی تھی اور اب رونے لگا تھا!

”چپ بے۔“ درباری نے نفرت اور غصہ کے ساتھ کہا۔سیتا چونکی وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن۔۔۔ اس کے ہاتھ بازو جواب دے چکے تھے۔ درباری کی ڈانٹ کے بعد ببّل نے ڈر کر چلانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو کر لپکا جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ ببّل کے پاس پہنچتے ہی اس نے زور سے ایک تھپڑ ببّل کو مار دیا۔ ببّل لڑھک کر دور جا گرا۔

”شرم نہیں آتی؟“ کہیں سے مصری کی آواز آئی۔ درباری نے پلٹ کر

دیکھا۔۔۔ مصری نہیں سیتا تھی جو کسی ان جانی طاقت کے آ جانے سے نیم برہنہ حالت میں اٹھ کر ببّل کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ ببّل سیتا کی چھاتیوں میں سر دیے رو رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منھ اٹھایا اور بندھی ہوئی گِھگّھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ اس نے مجھے مارا۔ درباری کو محسوس ہوا جیسے اتنے صاف سُتھرے کپڑوں میں بھی وہ گندہ ہے، وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا، جتنا ببّل سے۔۔۔ لیکن اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اٹھایا اور ببّل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ننگی تھی اور ببّل سے اپنے ننگے پن کو چھپا رہی تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان تھا جو اس کمینہ حد تک اتر آیا تھا۔۔۔ پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی!

شر مساری، ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ ببّل کی طرف بڑھایا اور سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی ببّل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ ببّل خود ہی بیتاب ہو کر درباری کے بازوؤں میں لپک گیا اور روتے ہوئے الٹا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو اس نے مجھے مارا۔۔۔اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس۔

"سیتا!" درباری نے کہا۔سیتا کچھ نہ بولی۔ وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلو کھینچا اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"سیتا!" درباری پھر بولا، "تم کبھی۔۔۔ کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "ہم پہلے شادی کریں گے۔"

اور پھر اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔سیتا نے درباری کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ درباری سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں درباری

کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ دونوں کے دکھ ایک ہو گئے اور سکھ بھی۔۔۔ ان دونوں کو روتے ہوئے دیکھ کر ببّل نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی درباری کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔ جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے کرمرے کے لئے درباری کی مٹھی کھولنی شروع کر دی۔

سونفیا

سونفیے کی خوشبو گاڑھی دھند کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آم کے اس قسم کے بیسیوں پیڑ تھے، جو گور پرساد نام کے اس بنگلے میں لگے ہوئے تھے۔ کتا گھاس اور ڈاھلیا وغیرہ سے تو کیا ہوتا، موگرے اور گارڈینیا کی خوشبو بھی سونفیے نے دبادی تھی، ایسے ہی جیسے لیلا مانک کی جوانی نے مندر کے بھجنوں کی قدر گھٹادی تھی۔

یہ آم کی اس تیز تر خوشبو ہی کی وجہ سے تھا کہ مکندی نے اچھی بھلی بھگوان کی اس لیلا کا نام سونفیا رکھ دیا تھا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ماں کا بیٹا بنگلے سے فرلانگ

بھر ادھر ہی (اپنی) چھاتی پر ہاتھ رکھ کہ کہہ دے کہ سونفیا اس وقت گھر ہی پہ ہے۔ جن مردوں کی ناک کے بالوں میں عورت کی بو سے کھجلی نہیں ہوتی، وہ تو قرائن ہی سے کہتے تھے۔۔۔ مثلاً یہ کہ سونفیا کا ریلے سائیکل بر آمدے میں اپنے اسٹینڈ پر کھڑا ہے اور اس کا پچھلا پہیہ بودھ لوگوں کے تقدیر کے چکر کی طرح اپنے آپ ہی دھُرے پہ گھومتا جا رہا ہے، اس کی ٹیلی فنکن میں کہیں کرناٹکی سنگیت کا بکرا ذبح ہو رہا ہے اور یا پھر اُتر پچھم کی طرف اس کے کمرے کی خس تھوڑی اٹھی ہوئی ہے، البتہ بلائینڈ کھنچے ہوئے۔۔۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ لُو ابھی تک زوروں پر تھی۔ پرماتما تو جیسے اپنا کرم دھرم ہی بھول گیا تھا اور مانس کے بدن پر سے کھال کھینچ کر نرممتا سے اسے کسی نمک کی کان میں دھکیل رہا تھا۔ اَن گنت باریک باریک سے اگنی بان تھے، جو بدن کے پور پور میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ دراصل ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرّے تھے، جو لُو کے ساتھ دریا کی طرف سے اُڑ اُڑ آتے تھے اور جسم میں پیوست ہو جاتے تھے۔ گری لال، مکندی کے دوست، نے کہا بھی تھا کہ لُو تھم جائے گی تو چلیں

گے، لیکن مکندی ڈرتا تھا کہ لُو کے تھمتے ہی سونفیا دریا کی طرف نکل جائے گی، جہاں ایسے بھبھاکا سے موسم میں پھر تھوڑی تسکین کی ہوا چلتی ہے۔ دریا کا جوبن ماتا حصہ چھوڑ کر، اس جگہ پہ جہاں پانی چھوٹے چھوٹے پوکھروں اور نالیوں میں بٹ جاتا ہے، انسان اور حیوان ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ کتّے اپنے عضو، اپنے خصیے اور پیٹ پانی میں ڈبو کر، بڑی بڑی زبانیں باہر نکالے ہانپ رہے ہوتے ہیں اور ان میں سے پسینے کے بڑے بڑے قطرے باہر ٹپکتے ہیں۔ لوگ باڑ سے بچے ہوئے تربوز ریت میں سے نکلوا کر لاتے ہیں اور کسی جبر کے عالم میں خالی ہاتھوں ہی سے انھیں پھاڑ کر بڑے بڑے کھپڑ بناتے ہوئے اپنے منہ اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ کچھ دور سے دیکھنے پہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ تربوز کہاں ختم ہوتا ہے اور ان کا منہ کہاں سے شروع؟ پہلے یوں لگتا ہے جیسے وہ تربوز کھا رہے ہیں، پھر تربوز انہیں کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گودا، بیج، منہ، سب بے تحاشا بکھرے ہوئے نیچے بالوں میں دھنستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں میں صبر ہوتا ہے وہ تربوز کو ایسے ہی سر کے نیچے رکھ کر ٹھنڈی میٹھی ریت پہ لیٹ جاتے ہیں اور اپنے

نفسانی ہاتھ اس کے گولائیوں پر پھیرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں کی حدّت سے تربوز بھی جل اُٹھتا ہے، پھر وہ نہیں جانتے کہ اسے کھائیں یا پھینک دیں۔ کچھ جذباتی ناکتخدا ایسے ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر لیموں کو ملتے جاتے ہیں جو کہ لُو کا پورا حملہ خود پر لے کر پہلے تو لال ہو اُٹھتا ہے لیکن آخر میں کالا پڑ جاتا ہے۔

لُو سے بچنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہوتا ہے البتہ، ایک یہ بھی رسائین کہ آدمی چلتا ہوا خواہ مخواہ سردی محسوس کرنے لگے۔ اور اگر سوچ بچار کی اتنی رسائی نہ ہو تو لُو کے تیروں اور دانتوں کو کند اور بے اثر کرنے کے لیے ایسے ہی ہمک ہمک کر، اچھل اچھل کر گانے لگے!

لل لو، لل لو، لل لو، لل لو۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ پھر لُو کا کہیں نام و نشان نہیں رہتا، اور نہ انسان کا، کیونکہ جب تک لُو یوگ مایا ہو چکی ہوتی ہے اور بے چارہ انسان یوگی!

گور پر ساد کی باڑیں اور بیلیں سب جھلس چکی تھیں، کہیں نام کے لیے اوپر کوئی پتّا

ہرارہ گیا تھا۔ اس دبی ہوئی، نامحسوس مسکراہٹ کی طرح جو دل میں کسی شرارت سے اپنے آپ ہونٹوں پہ چلی آتی ہے۔ گری لال تو پھاٹک کے باہر ہی رُک گیا اور کہنے لگا: "نا بھیا، میں تو نہ جاتا، اندر۔"

"کیوں یار؟" مکندی نے پوچھا "کیا مصیبت ہے؟"

گری نے پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جو یوں تو ہرے رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا، لیکن اس پہ سفیدے سے پتی ہوئی ایک تختی لگی تھی جس پہ کالے حرفوں میں لکھا تھا: کتے سے بچو!

مکندی گری لال کو کیسے بتاتا کہ کتا دراصل جانور نہیں ہوتا وہ صرف ایک احساس ہوتا ہے جو کثیف ہو کر چار ٹانگوں، ایک دم اور بڑے بڑے جبڑوں کو پھیلائے ہوئے بھونکتا چلا آتا ہے۔ ایسی بات نہیں، بیچ میں کہیں بدن بھی ہوتا ہے اس کا جسے وہ اپنے اندر کی وافر صحت سے اجنبی پہ یوں پھینک دیتا ہے جیسے غلیل مٹّی کے ڈھیلے کو۔ ایک پل کے لیے مکندی کو اپنا آپ جاہل، بے معنی اور بے وقوف

لگا۔ اور کتا۔ لیکن آخر سمجھ چلی آئی جو کہ نزع میں بھی بے اختیار اور مجبور ہو کر چلی آتی ہے اور سونفیے کی زندہ خوشبو سے گڈ مڈ ہو جاتی ہے۔ سمبل کے نرم نرم، سفید سفید، گداز گداز پری کہانی کی طرح گولے پھاٹک کے آہنی کلیمپ میں پھنسے ہوئے تھے۔ مکندی نے ایک ہاتھ سے کلیمپ کو اُٹھایا اور دوسرے سے پھاٹک کھولتے ہوئے کہنے لگا: ”تم آؤ تو۔۔۔“

گری لال وہیں رُکا ایک ڈرے ہوئے بچے کی طرح انکار میں سر ہلاتا رہا۔

مکندی نے گری کے گرد ہاتھ ڈالا اور کہنے لگا: ”کاٹے گا تو میرا ذمّہ، تمہارے کیا دانت نہیں ہیں!“ اور پھر وہ ہنس دیا۔

گری لال کو اب تک یقین نہ تھا۔ پچھلی بار جب دت کے مونگرل نے اسے کاٹا تھا تو پورے چودہ ٹیکے لگوانے پڑے تھے۔ نہ صرف پیچھا سوج گیا تھا بلکہ ٹانگ میں بھی ایک طرح کا لنگ سا پیدا ہو گیا تھا، جو کسی علاج سے نہ جا رہا تھا اور جس کے کارن گری کی طبیعت ہمیشہ گری گری سی رہتی تھی۔ اس پہ طرفہ یہ کہ موتی دت

کا مونگرل، اس کا دوست ہو گیا تھا۔ موتی کا رنگ کالا تھا، اس لیے صبح کے وقت
جب گری لال ہوا خوری کے لیے نکلتا اور موتی اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر
دیتا، تو ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ یدھشٹر ہے اور موتی وہ کالا کتا جو یدھشٹر کے ساتھ
ہمالہ کی بلندیوں پہ چلا گیا تھا، جہاں وہ اور اس کا مالک دونوں برفوں میں گل کر مر
گئے تھے۔ مکندی کے مجبور کرنے پہ گری بنگلے کے اندر چلا گیا، لیکن اس انداز
میں کہ اگر ضرورت پڑے تو بھاگ بھی سکے۔ پھر وہ حیران بھی ہو رہا تھا کہ
مکندی اپنی لڑکی سے ملنے آیا ہے، تو ساتھ اسے کیوں لے آیا ہے؟ شاید مکندی
کے اندر بھی کوئی کتا تھا جس سے وہ ڈر رہا تھا اور جس سے بچنے کے لیے اسے کسی
بھی دوسرے آدمی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ہاں، انسان کو انسان کی ضرورت
تو ہے ہی، ورنہ سب مردے اپنے آپ اُٹھ کر اپنی اپنی قبر میں لیٹیں۔۔۔ خود کو
وافر لگنے کے باوجود ایک تحیر گری لال کو اندر لیے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی
سرریلسٹ تصویر میں کے مرد کی آنکھوں کی طرح پپوٹوں سے دو دو انچ باہر نکلی
ہوئی تھیں، اور ان پہ پیٹ بنا ہوا تھا۔ وہ سونفیا کو دیکھنا، نظروں سے اسے ٹوہنا اور

اس کے ساتھ لپٹنا چاہتا تھا۔ سونفیا۔۔۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر گز ہر گز خوبصورت نہیں ہے، لیکن اس قدر متناسب اعضا اور بھرپور صحت والی ہے کہ۔۔۔ (یہاں سے تحریر کا عجز شروع ہو جاتا ہے!)

جن لوگوں نے گورے رنگ پہ جان دی ہو، جانتے ہیں کہ اس میں آپ کچّے گوشت کے احساس سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن سونفیا کا سا کالا، نہ گورا رنگ ہمیشہ تندرستی کا نہ صرف لبالب بلکہ چھلکتا ہوا جام ہوتا ہے جو مرد کے گوگاں کو دور افتادہ جنوب مشرقی جزائر میں لے جاتا اور وہاں پوری زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ سونفیا کے ملائم اور چکنے بدن کی تعریف گری لال نے کان پور میں سُنی تھی، جہاں کے چمڑہ رنگنے والے اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سب سے اچھی جلد کون سی ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کو کنواری چاہنے کے باوجود قریبی سے قریبی دوست بھی خوبصورت عورت کے سلسلے میں اپنے آپ کو بدل کے طور پر رکھتے ہیں۔ وہ دیور کہلواتے اور بھابی کہتے ہیں اور جو بھی تھوڑی بہت لذّت ہاتھ آئے، لے کر چل دیتے ہیں، اور اب تو سونفیے کی خوشبو اور بھی تیز اور بوجھل ہو گئی

تھی۔ بنگلے کا واحد سمبل ہوا اور لُو کے جھونکوں کے ساتھ اپنا رواں چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، خوشبو چھوٹے چھوٹے خواب بن کر چاروں طرف بکھر رہی ہے، یا وہ کوئی کنفیٹی ہے جو عشق کو خوش آمدید کہنے کے لیے اوپر کے کسی حکم سے مکندی پہ گرائی جا رہی ہے، لیکن پھر۔۔۔ لُو؟

عشق سے بڑی لُو اور کون سی ہوتی ہے؟ دونوں دوست، مکندی اور گری لال، اس راستے پہ چلنے لگے جو دو طرفہ ہو کر، بیچ کے سوکھے سڑے باغیچے اور خشک فوارے کو لپیٹ میں لے کر، سامنے کے پورچ میں مل جاتا تھا اور جس پہ لال لال راجستھانی بجری پڑی جوتوں کے منہ میں کچر پچر کر رہی تھی۔ آخر وہی ہوا۔ مکندی اور گری کی بو پاتے ہی جبرو، سونفیا کے گریٹ ڈین، منہ پھاڑے ہوئے ان کی طرف لپکا۔ کتے کی آواز کتے ہی کی سی ہوتی ہے، لیکن جبرو کی کچھ شیر کی سی تھی۔ چونکہ کتے اور شیر میں کراس ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے جبرو آخر کار کتا ہی تھا۔ وہ دس برس اور بھی جیتا رہتا تو کتا ہی رہتا، پِلّے ہی پیدا کرتا لیکن اس کے باوجود اسے یوں خونخوار طریقے سے لپکتے دیکھ کر مکندی اور گری لال وہیں تھم

گئے۔ گری تو مکندی کے پیچھے چھپ گیا اور منہ میں استوتر پڑھنے لگا لیکن مکندی ویسے ہی نڈر کھڑا تھا، البتہ ہاتھ اس کے بھی صلح کی جھنڈی میں اُٹھے ہوئے تھے اور وہ پکار رہا تھا: جبر و، جبر و، جبر و۔۔۔

جو لوگ کتے کی نفسیات سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ آپ تھم جائیں تو کتا بھی تھم جاتا ہے اور مشکوک انداز سے دیکھتا ہوا کچھ دور کھڑا بھونکتا ہے۔ وہ کبھی تو ایک ٹک نو وارد کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف منہ کر کے مالکوں کو کچھ کہتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ بیچ میں وہ اگلے پنجوں کے بل نیچا ہو ہو کے زمین کھڈیرتا، چھوٹی سی جست لیتا، آگے بڑھتا، پیچھے ہٹتا، سر کو چھوٹے بڑے جھٹکے دیتا ہوا مسلسل بھونکتا چلا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہہ رہا ہے: آ بیٹا، ماں کا دودھ پیا ہے تو آ مقابلے پہ۔ وہ شہ دیتا ہے اور مات کھاتا ہے، لیکن یہ سب برابر والے کی اینڈوکرین گلٹی پہ نربھر ہے۔ اگر اس کی گلٹی جلدی جلدی اور تیز تیز ڈر کے لعاب کو خارج کرنے لگے تو کتا، جس کی سونگھنے کی قوت بے پناہ ہوتی ہے، پہلے معاملے کی تہہ پہ پہنچ جاتا ہے اور آخر آدمی کہ تہہ پر۔

مکندی بالکل نہ ڈرا۔ اس نے ایک نظر اپنے اور پھر گری کے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ کسی چپراسی، بھنگی یا بھک منگے کے تو نہ تھے جن سے کتوں کو خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ کمینہ! خود چاہے سارا دن کیچڑ اور گندگی میں کودتا پھاندتا پھرے، لیکن سامنے والے کو برابر صاف اور سُتھرا دیکھنا چاہتا ہے جو کہ بدمعاشی اور ناانصافی کی انتہا ہے۔ مکندی بدستور۔۔۔ جبرو، جبرو۔۔۔ پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ جبرو نے کچھ رُک کر ایک غیر۔ یقینی انداز سے بھونکا، پھر پاس آیا اور مکندی کو سونگھا، پیچھے کی طرف دیکھ کر بھونکا۔ یہی عمل اس نے گری کے پاس پہنچ کر دُہرایا۔ قریب ہی تھا کہ گری اُلٹے پاؤں بھاگ نکلے، لیکن مکندی نے مضبوطی کے ساتھ اسے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا اور بولا: "سونگھ لینے دے، ایک بار اسے سونگھ لینے دے، گری۔" ہو سکتا ہے گری کی پتلون کو سونگھنے پہ جبرو کو کچھ دھندلی دھندلی شکلیں نظر آئی ہوں۔ پھر اس نے منہ اُٹھا کر گری کی طرف دیکھا۔ کیا یہ وہی ہے؟ بیچ میں مکندی آ گیا۔ اب جبرو دُم ہلا رہا تھا اور اِدھر اُدھر پھر کر ایک عجیب طرح کی بے بس اور گڑل آوازیں نکال رہا تھا، جیسے اس کی سمجھ

میں کچھ نہ آرہا ہو۔ پھر وہ بھاگتا ہوا لکڑی کے کھمبے کے پاس پہنچ گیا جس کے اوپر رات کو روشنی کے لیے بتی لگی تھی۔ جب ہی اس نے ٹانگ اُٹھائی اور دنیا بھر کے کتوں کی طرح اپنے تناؤ کی تسکین کرلی۔

سامنے، برآمدے میں، سونفیا کی خادمہ جامن کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مکندی آگ بگولا ہو اُٹھا: ”باندھ کے کیوں نہیں رکھتیں اس باپ کو؟“

جامن ہریانے کے علاقے کی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس کا بدن گٹھا ہوا تھا اور رنگ سیاہی مائل۔ سونفیا نے اسے شاید اپنا رنگ، اپنا بدن آف سیٹ کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا اور مالش میں اپنی گرمی اس تک منتقل کرنے کے سلسلے میں اسے ٹھنڈائی سردائی وغیرہ پلاتی رہتی تھی۔ مکندی کی بات کے جواب میں جامن شرما دی۔ بھلا شرمانے کی کیا بات تھی اس میں؟ لیکن وہ بے چاری عمر کے اس حصّے میں تھی جس میں لڑکی کو کچھ بھی کہیں تو وہ شرما جاتی ہے۔ آپ اسے مونگ کی کہیں تو وہ موٹھ کی سمجھ لیتی ہے اور پھر شرما جاتی ہے۔ آپ پوچھیں: ”تم شرمائیں کس بات سے؟“ تو اس کے جواب میں بھی وہ شرما جاتی ہے۔

جامن نے بر آمدے میں بید کی دو کرسیاں مہمانوں کے لیے سر کا دیں اور خود مالکن کو اطلاع کرنے کے لیے اندر چلی گئی حالانکہ جبرو کے بھونکنے سے اسے ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ کوئی آیا ہے۔ لیکن کسی بھی لڑکی سے، خاص طور پر جب کہ وہ جوان ہو، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ یوں دھڑ سے باہر چلی آئے گی۔ پہلے وہ اپنا آپ ٹھیک ٹھاک کرتی ہے، گڑیا کی آنکھ سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی ہوئی وہ اس پہ کے ایک ہی مہاسے کو پاؤڈر سے کوستی ہے اور پھر پاس پڑی کالی پنسل کو اُٹھا کر ٹھوڑی کے بائیں طرف، دیکھنے والے کی آنکھ کی پتلی کے برابر، ایک تل سا بناتی، اپنے قاعدے سے پٹے ہوئے بالوں میں سے چند ایک کو سرکش کرتی، آخری بار آئینے میں دیکھتی ہے کہ اس کے بدن، اس کے لباس میں رات کا تو کچھ نہیں؟ وہ یہ سب کرتی ہے، چاہے اسے اپنے ملاقاتی سے اس ناخن برابر بھی دل چسپی نہ ہو جسے وہ ابھی ابھی مینی کیور یا پالش کرتی آئی ہے۔

جب تک مکندی اور گری لال بیٹھ گئے، بالکل ہی۔ جب ہی گری نے مکندی سے پوچھا: ”جبرو نے شروع میں بھی کبھی تمھیں کاٹنے کی کوشش نہیں کی؟“

”نہیں۔“ مکندی نے جواب دیا۔

”کیوں؟ کتّے تو۔۔۔“

”بات یہ ہے کہ جب آدمی نے خود کتّا رکھا ہو، اسے دوسرے کا کتّا کبھی نہیں کاٹتا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب، اپنے کتّے کی بُو اس میں رس بس جاتی ہے نا، جس کا ہمیں تمھیں پتہ نہیں چلتا لیکن کتّے کو ہمیشہ چل جاتا ہے۔ پھر وہ دُم ہلانے، چاٹنے لگتا ہے۔ کتّا ہمیشہ اسے پیار کرتا ہے جس کے پاس کتا ہو۔“

”ہاں، تمھارا وہ براؤن ڈاشنڈ، رکی۔۔۔ بڑا پیارا کتّا ہے“!

جبھی سونفیا اپنے لانبے بالوں کا جوڑا بناتی، دونوں ہاتھوں سے اسے دباتی ہوئی باہر آئی۔ وہ یہ کام اندر بھی کر سکتی تھی لیکن شاید وہ یہیں باہر ہی اچھا تھا۔ دونوں

بازوؤں کے اُٹھنے سے سونفیا کا اصل دکھائی دیتا تھا۔ گری لال اور مکندی تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے اور نمستے کی۔

گری لال کا تعارف کراتے ہوئے مکندی نے کہا: گری لال، میرے دوست ہیں، کانپور میں ایل آئی سی میں کام کرتے ہیں۔"

سونفیا نے سر ہلا دیا اور جان بوجھ کر اپنی آنکھوں میں سے غائب ہو گئی، جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتی تھی اور جس سے اس کے کئی گملٹ پیے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "بیٹھیے۔"

سونفیا بیس بائیس برس کی ایک کھلے ہاتھ پیر والی لڑکی تھی۔۔۔ مطمئن بالذات۔ اس کے اس اطمینان میں فن کتنا تھا اور نیچر کتنی، اس کا اندازہ آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ اس میں کی آگ کا صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا جتنا کہ بجلی کے تار کو دیکھنے۔۔۔ صرف دیکھنے سے اس میں کی قوّت اور جوش کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش موٹے موٹے اور بھرے پُرے تھے۔ وہ اپنی عام حرکت میں

بھنگڑہ ناچنے والوں کی طرح سے قوّت کو اندر کھینچنے کی بجائے باہر پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، یا شاید ویسے ہی اس کی صحت عام ہندوستانی لڑکیوں سے اچھی تھی۔ جامن۔۔۔ جو دیہاتی خوبصورتی کا اچھا نمونہ تھی۔۔۔ اس کے سامنے یوں ہی معلوم ہوتی تھی جیسے آم کے سامنے جامن۔ وہ گوری تھی یا گندمی یا کچھ اور بھی، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ دھوپ میں ہوتی تو تانبا ہو جاتی، سایے میں ہوتی تو سفید، دریا کے کنارے سانولی اور اپر انڈیا کلب میں سلونی۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود وہ روز صبح مندر ضرور جاتی تھی، شاید اس لیے نہیں کہ اس میں اس کی آتما کو شانتی ملتی تھی، بلکہ اس لیے کہ مندر جانے والا آدمی وقت پہ سوتا اور وقت ہی پہ جاگتا ہے جس سے بدن کی رطوبتیں خشک نہیں ہوتیں اور وہ ہرا بھرا اور شاداب رہتا ہے، اندر کا فریجڈیئر جو جسم کے اعضا کو یکجا اور تر و تازہ رکھتا ہے اچھی طرح کام کرتا ہے۔ اسی لیے جب مندر سے سفید ساری میں ملبوس سونفیا باہر آتی تو دیوی لگتی اور کلب میں جاتی تو صوفیا لارین۔ اس کی آواز میں سے کئی ریزے، کئی دانے غائب تھے۔ شاید وہ اپنے ارادے سے انہیں غائب کر دیتی

تھی۔ بہر حال، اس کی آواز میں ایک انگیخت پیدا کرنے والا کھر کھرا پن، ایک اٹوٹ رکھب سا رہتا تھا جو کبھی مدھم پہ نہ پہنچتا، جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں سے مفرور ہو جاتی تھی، ایسے ہی گلے سے بھی۔

جامن نے ایک اور بید کی کرسی سرکا دی لیکن سونفیا نے بیٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ یوں ہی کھڑے کھڑے وہ مغایرت کے انداز میں بولی۔ "کہیے؟"

مکندی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ مطلب یوں تھوڑے کہتے ہیں؟

پھر سونفیا نے بازو اُٹھا کر اپنے جوڑے میں ایک سوئی کو دبایا اور انگریزی میں روکھے پھیکے انداز سے کہا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

مکندی کے اوسان اور بھی خطا ہو گئے۔ گری ساتھ نہ ہوتا تو وہ اُسے جوتا بھی مار دیتی تو کوئی پروانہ تھی، لیکن اس وقت۔۔۔ مکندی کو غصّہ آیا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ قدرت میں کتنی بے رحمی تھی جو مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی۔ کاش وہ اپنے آپ میں مکمل ہوتے۔ سونفیا نے ہمیشہ

اس سے ایسی ہی بے رُخی برتی تھی۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی! وہ تعلیم یافتہ تھا۔ لکھنؤ سے ایل ایل ڈی کر چکا تھا۔ پھر وہ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ پچھلے ہی سال وہ صحت کے مقابلے میں مسٹر لکھنؤ قرار دیا گیا تھا۔ مکندی نے اپنے آپ کو روکا۔ اندر کے جبر و کو تہذیب و اخلاق کی ایک موٹی سی زنجیر کے ساتھ باندھ دیا ورنہ اگر کوئی لڑکا بڑھ کر کسی لڑکی سے کہہ دے "آپ میرے لیے کر ہی کیا سکتی ہیں؟" تو پھر لڑکی کے پاس کیا رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ اس کا رنگ پیلا پڑ جائے اور منہ پر کف لاتے ہوئے وہ اپنے بازو کی سویپ کے ساتھ باہر کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہے۔ "چلے جایئے، نکل جایئے میرے یہاں سے۔" مصلحت۔۔۔ مکندی نے کہا تو صرف یہ۔ "اس دن۔۔۔ آج میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا لیلا دیوی ہی کو سلام کرتے چلیں۔ اس دن اپر انڈیا کلب کے فینسی ڈریس میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا! بالکل مریہ گونڈ لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔" اور پھر دل میں کہا ایک موتیاری جسے سر پہ چٹائی رکھے ہوئے اس کا چیلک سرِ شام ہاتھ سے پکڑ کر گھوٹل میں لے آتا ہے۔ رات بھر وہ کنوارے

ایک دوسرے سے لپٹتے پیار کرتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی بیلو سا انہیں باہر دھکیل دیتی ہے، سورج کی روشنی سے پہلے کیونکہ وہ رات کی شرارتوں کو یاد کرتے ہوئے بہت زیادہ ہنستے اور کھکھلاتے ہیں۔

سونفیا نے کہا بھی تو صرف اتنا۔ ''شکریہ''!

وہ ٹھنڈی تھی؟ برف کا تودہ؟ پتھر میں بھی تیل ہوتا ہے۔ شاید کسی بو کسی لمس نے اس کے اندر کی آگ کو نہیں بھڑکایا تھا۔ اتنی لُو میں بھی وہ پگھل اور پسیج نہ رہی تھی۔ مکندی نے کچھ اور باتیں کرنے کی کوشش کی۔ ایسی باتیں جن کا جواب لمبا ہو، لیکن سونفیا جانے اختصار کی روح کو پا گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا جواب دیتی، بلکہ ٹکا سا۔ مکندی نے اسے وہ سماں یاد دلایا جب وہ سفید ساری میں ملبوس نروتم کے مندر سے نکلی تھی اور صبح کے دھندلکے کی طرح سے حسین معلوم ہو رہی تھی اور شانت۔ مندر کی سیڑھیوں پر کوئی سور داس اکتارے پر ولمپت لَے میں بھیرویں کے سُر اَلاپ رہا تھا۔ اور دل میں کہا۔ ''جب تم سے لپٹنے، تمہیں پکڑنے کے بجائے تمھارے قدموں پہ لوٹنے کو جی چاہتا ہے۔''

مندر سے لوٹنے والی یوتی سے بات مت کرو کیوں کہ وہ آفاقی ہو چکی ہے۔ اس وقت کا انتظار کرو جب ایک بار پھر اس میں مقامیت لوٹ آئے۔۔۔

لیکن کیسے؟ سونفیا تو جیسے مندر سے نکلتی ہی نہ تھی، مقامیت کو لوٹتی ہی نہ تھی۔ کسی کو سامنے پاتے ہی وہ کہیں دور پہنچ جاتی۔ دریا کے کنارے اس کی سہیلیوں کا جمگھٹ اس کے ارد گرد رہتا تھا اور کلب میں منچلوں کا۔ اور وہ کسی کی پکڑ میں نہ آتی تھی۔ وہ اَنیک سے ایک ہوتی تو بات بنتی۔ وہ اپنے بدن کو صحت سے بھرتی جا رہی تھی جو کہ اب تک قارون کا خزانہ ہو چکی تھی۔ وہ اس سیدھی سادی حقیقت کو نہ جانتی تھی کہ عورت نام ہے خرچ ہونے کا، گھٹنے اور بڑھنے کا، مناسب وقت کے بعد خاک اور خون میں لت پت ہونے کا۔۔۔ ورنہ وہ عورت نہیں رہتی، لیونارڈو کا شاہکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

یا شاید مکندی اناڑی تھا اور نہیں جانتا تھا کہ لڑکی سے بات کیسے کی جاتی ہے؟ بات کر بھی لی جائے تو آگے کیسے بڑھائی جاتی ہے؟ شرافت سے بات بنتی ہے یا غنڈہ گردی سے؟ اسے صحیح تو ایک طرف، غلط سلط طریقے سے بھی لڑکی کا تجربہ نہیں

ہوا تھا۔ غالباً وہ ان مردوں میں تھا جو کسی طرح سے اپنے چال چلن کو خراب نہیں ہونے دیتے اور سمجھتے ہیں، یہ بات عورت کو بہت متاثر کرتی ہے۔

جانے سونفیا اس سے اس لیے بات نہیں کرتی کہ وہ خوبصورت تھا اور مسٹر لکھنؤ۔ ایسے آدمی کے بارے میں لڑکی کو یقین نہیں آتا۔ یا پھر اس میں ایسا کوئی جذبہ ہے جس سے وہ بدصورت اور جنگلی قسم کے آدمی کو ترجیح دیتی ہے۔ کیا اس لیے کہ حسن اور خوبصورتی، نرمی اور گداز پن اور مظلومیت اسی کا اجارہ ہیں اور بدصورتی اور کرختگی اور بربریت مرد کا؟

مکندی نے سوچ لیا کہ اب اس کی دوڑ دھوپ سے کوئی کام نہیں بنتا۔ گورپرساد ہی کچھ ہو تو ہو۔ بنگلے سے نکلتے وقت جبرو نے منہ اٹھا کر بھی تو نہ دیکھا: کہاں وہ شور وشغب کے زلزلے لے آیا تھا۔ پھاٹک کی طرف بڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سمبل نے اپنی پری کہانیاں روک کر ان کے گھٹیا جاسوسی قصّے بنا دیے تھے اور انھیں ریلوے کے بُک اسٹالوں پہ بیچنا شروع کر دیا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام میں وہ گالے Nuns کی طرح سے سفید اور پاکیزہ خیالات کی بجائے کالے بھجنگ،

گندے اور فحش دلال ہو گئے تھے۔ آم گلنے، سڑنے لگے تھے اور انسان کے کام و دہن نے ذائقے سے منہ موڑتے ہوئے انھیں پیڑ ہی پہ متعفّن ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اور جامن کو اس بات کے لیے مجبور کر دیا تھا کہ وہ جبر و سے مجامعت کرے اور بار بار کرے۔

اسی شام اپر انڈیا کلب میں بڑی رونق تھی۔ بمبئی سے ارشاد پنجتن (Mime) نقال چلا آیا تھا، جس نے حال ہی میں مغرب کا نہایت کامیاب دورہ کیا تھا۔ ہر دار الخلافے میں اس کی کمانڈ پر فارمنس ہوئی تھی جو تیقن کی چمک اس کی آنکھوں میں اور خوش حالی کی سُرخی گالوں پہ لے آئی تھی۔ اس نے لوگوں کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ صرف مکندی ان سب سے کٹا ایک طرف بیٹھا گملٹ میں اپنی کچھ دیر پہلے کی ہزیمت کو ڈبو رہا تھا۔ گری لال جان بوجھ کر سٹک گیا تھا۔ ہاں، ہارے ہوئے آدمی کے ساتھ ہمدردی کرو تو بُرا، نہ کرو تو بُرا۔ اور اس ہاں اور نہ کے بیچ کا فن نہایت گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ نہ معلوم سونفیا کے سلسلے میں مکندی نے اس کے سامنے کیا کچھ ڈینگیں ماری تھیں، جو۔۔۔

برج اور شطرنج کھیلنے والے بھی اپنے اپنے کھیل چھوڑ کر تھیٹر کارنر میں ارشاد پنجتن کی نقالی دیکھنے چلے گئے تھے۔ بیرے بے کاری کے عالم میں وہسکی، شیری یا رَم کی بوتل کے ساتھ خالی گلاس اور سوڈا ٹرے پہ رکھے اور چابی ہاتھ میں لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ آرکسٹرا کا گوانی لیڈر اپنے ریگولیشن سوٹ میں کوئی اذیت سی محسوس کر رہا تھا۔ دن کے مقابلے میں اس وقت گرمی کم تھی کیوں کہ لُو چلنا بند ہو گئی تھی، لیکن اس پہ بھی شرابی کے اُلٹے سانس کی طرح سے بیچ بیچ میں گرم اور متعفّن ہوا کا جھونکا چلا آتا تھا کیوں کہ کلب کے نیچے ہی شہر کا گندا نالہ تھا جس کا پانی کوئی سوڈیڑھ سو گز پرے دریا میں گرتا تھا۔ وہ بار بار اپنا سفید رومال نکال کر اپنا منہ اور اپنی گردن پونچھتا تھا اور پھر نہ جانے کیوں اس رومال کو دیکھتا تھا جس پہ مٹی اور پسینے کی میل چلی آئی تھی۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کالا رنگ جانے لگا ہے اور کچھ دنوں میں وہ گورا ہو جائے گا۔ پھر وہ جھلّا کر ڈبل بیس پہ اپنا ہاتھ مار دیتا تھا جس سے عجیب طرح کی بیزار کر دینے والی آواز نکلتی تھی۔ اکیلا ساز اور وہ بھی بے وقت بے ہنگم طریقے سے بجے تو ایک اینٹی میوزک کی سی

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جتنا میوزک سے لطف آتا ہے، اتنی ہی اینٹی میوزک سے بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ آخر سارا سلسلہ ساز و آہنگ ہی کا ہے نا!

شیلو گورنر کے اے ڈی سی کی لڑکی تھی اس لیے وہ اپنے آپ کو گورنر ہی سمجھتی تھی۔ اور یہ تھا بھی ٹھیک کیونکہ بڈّھا گورنر جب بھی دورے پہ جاتا تھا شیلو کو اپنے خاص سیلون میں ساتھ لے جاتا تھا اور کسی کو پتہ نہ چلتا تھا کہ کسی گھاتک کو پھانسی کی سزا سے عمر قید میں بدل جانے یا بالکل ہی چھوٹ جانے میں شیلو کا کتنا ہاتھ تھا۔ شیلو کی عمر کوئی تیس ایک برس کی تھی مگر وہ کنواری تھی۔ شادی کے سلسلے میں اس کی عمر ممکن شوہروں کو آزمانے ہی میں گزر گئی تھی۔ لڑکیوں کے لیے اکثر ان کے بڑے باپ کی بیٹی ہونا زیادہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہونا ان کی شادی کے منافی ہوتا ہے۔ شیلو یوں کوئی ایسی فلرٹ نہ تھی لیکن اس وقت ساز اور آہنگ کے کھیل میں وہ اس کم بخت مائیم کے آ جانے سے صرف ساز ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے سدھانت شہر کے چیمبر آف کامرس کے پریذیڈنٹ کے ساتھ وہ والٹس ناچتی رہی تھی، لیکن مائیم کے منظر پہ آتے ہی سدھانت نے شیلو

کو یوں چھوڑ دیا جیسے انگریز لوگ ہاتھ سے گرم گرم آلو چھوڑ دیتے ہیں اور والٹس کا آہنگ شیلو کے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا۔ کسی لڑکی میں آہنگ شروع ہی نہ ہو تو وہ برسوں کسی تان پُرے کی طرح سے گھر میں ایک کھونٹی پہ لٹکی ہوئی رہ سکتی ہے لیکن اگر وہ شروع ہو جائے یا اسے کوئی چھیڑ دے تو پھر وہ دھُن یا ڈانس نمبر کو تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ اور والٹس کا آہنگ شیلو کے تقریباً کنوارے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا جسے وہ کہیں بھی کیسے بھی جھٹک دینا چاہتی تھی۔

اور سامنے مکندی بیٹھا تھا۔۔۔ خوبصورت اور مسٹر لکھنؤ!

اور اکیلا!

جانے اکائی عورت کو کیوں ہمیشہ پریشان کرتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ دوئی کی نمائندہ ہے اور اسے بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندسوں میں دو، تین، چار۔۔۔ ان سے زیادہ کی دلیل ہے اس لیے جب کہیں کوئی رشتے کی بات چلتی

ہے تو اس کا استمرار دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور وہ فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔ وہ۔۔۔ جمع اور ضرب کی قائل۔۔۔ خیر، یہ حساب کی باتیں ہیں۔ شیلو دونوں ہاتھ اُٹھا کر ان سے اپنے سر کے بالوں کو کچھ اور ڈھیلا اور بے ربط کرتی ہوئی مکندی کے پاس چلی آئی۔

"آپ۔۔۔ آپ نہیں دیکھنا چاہتے پینٹومائیم؟"

"نہیں۔" مکندی نے سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"مجھے نقل اچھی نہیں لگتی۔"

"اصل اچھی لگتی ہے؟" شیلو نے معنی خیز انداز سے کہا اور پھر اپنے آپ ایک کرسی سرکاتی ہوئی مکندی کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ "مجھے بھی یہ نقل پسند نہیں، زندگی کی نقل۔" وہ خفیف سا ہانپ بھی رہی تھی، جیسے حالات پہ کچھ غصّہ تھا۔ اس نے بیرے کو آواز دی جو پہلے ہی کہیں بھی کوئی بھی کام چاہتا تھا۔ وہ بھاگا ہوا

آیا، دست بستہ۔ ابھی اس نے مایوس ہو کر ٹرے بار کے کونٹر پہ جا رکھی تھی۔ شیلو نے آرڈر دیا۔ "ایک شیری، ڈبل"!

نہ چاہتے ہوئے بھی مکندی نے بیرے سے کہا۔ "میرے حساب میں۔"

"نہیں نہیں۔" شیلو نے احتجاج کیا اور پھر مکندی کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر بیرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "او کے، مورس"!

اور بیرا "یس میڈم" کہہ کر بار کی طرف چل دیا۔ تیز تیز۔

ارشاد پنجتن ایک دندان ساز کی نقل اُتار رہا تھا۔ پہلے اس نے دور سے مریض۔۔۔ فرضی مریض۔۔۔ کو آتے دیکھا اور خوش ہوا کہ گاہک پھنسا۔ اس کے آنے سے پہلے اس نے کرسی ورسی ٹھیک کی ہاتھوں سے ہی گرد کو جھاڑا اور جیسے ہی مریض آیا اس نے مؤدب طریقے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ایسے ہی منہ ہلا ہلا کر اس کی دردناک باتیں سنتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ بے چارہ درد کی شدّت سے رات بھر نہیں سویا لیکن دندان ساز بے نیازی سے اس کی داستان سنتا

رہا۔ پھر اس نے اشارہ کیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور اسے ڈینٹسٹ کی کرسی پہ بیٹھنے کے لیے کہا جس کے بعد اس نے مریض کو منہ کھولنے کی ہدایت دی۔ مائیم چونکہ دندان ساز بھی خود تھا اور مریض بھی خود ہی، اپنا منہ کچھ اس طریقے سے کھولا کہ وہ زمانہ یاد آگیا جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا۔ دندان ساز نے غار کی قسم کے اس منہ میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے فرضی بتّی کو کھینچ کر مریض کے برابر کیا اور روشنی میں اندر جھانکا۔ کیا ہوکا سا اندھیرا ہو گا کہ ڈاکٹر کو منہ میں انگلی ڈال کر مسوڑھوں اور دانتوں کو ٹوہنا پڑا۔ جب ہی وہ فرضی مریض ایک دم ٹیس سے بلبلاتا دکھائی دیا۔ غالباً دندان ساز کا ہاتھ اندر ہلتے جھولتے ہوئے دانت اور اس کے پاس کی کسی ننگی رگ کو جالگا تھا۔ ہاتھ نکالتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے تسلّی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جب کہ وہ شہر کے سب سے بڑے اور سب سے قابل دندان ساز کے پاس آگیا ہے اسے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے آنکھوں میں دہشت سمو کر دو تین بار کی مدر اسے بتایا کہ اندر بہت بڑی Cavity ہے جس میں سے اکبر کے زمانے کا پورا لشکر مع ہاتھی ہودے اور

گھوڑے وغیرہ کے گزر سکتا ہے۔۔۔ لیکن چٹنا کی کوئی بات ہی نہیں!

پھر اس نے مشین کے اوپر ایک فرضی بوتل سے روئی کے پھوئے نکالے اور ایک کے بعد دوسرا منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے دانت اور اس کے نواح کو آلائشوں سے پاک کیا۔ پھر دیکھا۔۔۔ بتّی کو اور نزدیک کرتے ہوئے۔۔۔ اور سر ہلایا کہ دانت نکالے بغیر گزارہ نہیں اور چپکے سے اوزاروں کی پلیٹ میں سے زنبور اُٹھایا جسے دیکھتے ہی مریض کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ڈینٹسٹ کو پھر اسے تسلّی دینا پڑی۔ پچکاری سے دانت اور اس کے نواح کے علاقے کو بے حس اور مردہ کرنا پڑا۔ آخر جب دانت اس کے اردگرد کا حصّہ حتیٰ کہ مریض بھی مردہ ہوگئے تو اس نے زنبور اندر ڈال کر مضبوطی سے دانت کو پکڑا اور ایک دو جھٹکوں ہی سے اسے باہر نکال دیا۔ اس کے جھٹکوں کے ساتھ مریض اُچھلتا بلبلاتا تھا، لیکن اب وہ ایک طرف ڈاکٹر اور دوسری طرف زنبور کی پکڑ میں تھا! وہ کر کیا سکتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا بے چارہ۔ ڈاکٹر بہت خوش تھا۔ اس نے دانت کو آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر سے کوئی پرچھائیں سی گزری۔ جب

ہی مریض کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو اسے پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے صحیح وسالم دانت کو نکال دیا تھا۔ ٹوٹا ہوا اور کرم خوردہ دانت ابھی وہیں تھا، جوں کا توں!

اب مریض اور ڈاکٹر دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اسی مشین اسی فرضی کرسی کے ارد گرد اور لوگ بے تحاشا ہنس رہے تھے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ مایئم اس قدر کمینہ تھا کہ مریض اور ڈاکٹر دونوں کی چال اور دونوں کی دوڑ کا ایک دم الگ الگ اور بے حد کامیاب نقشہ کھینچ رہا تھا۔

بیچ میں کہیں سونفیا بھی آگئی۔ ظاہر ہے کہ تھیٹر کارنر میں جانے سے پہلے وہ کلب ہال ہی سے گزر کر آئی ہو گی۔ آج اس نے معمول سے زیادہ دل کش میک اَپ کر رکھا تھا، اس پہ بھی وہ کچھ ایسی کھلی ہوئی نہ تھی جیسی کہ وہ عام طور پر ہوتی تھی۔ کیا وہ آج صبح مندر نہیں گئی تھی؟

مایئم نے اپنے پروگرام کی دوسری مد شروع کی جو کہ ایک فرسٹریٹڈ یعنی کہ محروم و مہجور عاشق کے بارے میں تھی۔ سب سے پہلے سدھانت سونفیا کو دیکھ کر مجمعے

سے باہر چلا آیا، پھر رشید علی، کلب کا منیجر۔ آرکسٹرا کے لوگ چوکنّے ہو گئے اور گوانی لیڈر اپنی ٹائی کی ناٹ کو کستا ہوا ڈبل بیس کے پیچھے آ بیٹھا۔ بیرا لوگ بھی مستعد ہو گئے۔ پھر ابھینکر نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مجمعے میں سے کھینچ لایا اور کشاں کشاں بساط پر لے آیا، بظاہر اگلی چال کے لیے۔ بے چارے مائیم کے کھیل کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دوسروں کا کھیل دیکھ رہا تھا!

سدھانت اور کچھ دوسرے لوگوں نے دیکھا مکندی اور شیلو وہاں سے غائب تھے۔ مرمر کے میز کی ٹاپ پہ دو گلاس خالی پڑے تھے۔ ایش ٹرے میں بہت سی سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے اور ایک طرف دستخط کیا ہوا بِل جس پہ پانچ کا ٹپ پڑا تھا اور جو صدر دروازے سے آنے والی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا!

کچھ دن بیت گئے۔ مکندی اور گری لال آپس میں ملے اور اور ایک دوسرے کی کمر میں ٹھوکے دے دے کر ہنستے ہنساتے رہے۔

چند لوگوں کو صرف سنیچر کی شام کو چھٹی کا احساس ہوتا ہے کیوں کہ اگلے روز کہیں آنا جانا تو ہوتا نہیں، مزے سے آدمی بستر پر پڑا منہ میں پرانی یادوں کی خوبانیاں پپول سکتا ہے اور اس کے ذائقے سے قندِ مکرّر کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔۔۔جو قند سے بھی زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

سنیچر کی شام کو جب گری لال مکندی کے ہاں شری نواس میں آیا تو دیکھا مکندی کا چہرہ کانوں کی لووں تک لال ہو رہا ہے۔ وہ خوش بھی تھا اور نہیں بھی۔ گری لال نے اس کی وجہ پوچھی تو دیکھا کہ جواب دینے میں مکندی بھی ایکا ایکی اپنی نظروں سے کہیں غائب ہو گیا ہے اور ہر بات کا جواب "ایں؟" سے شروع کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر پوچھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی بات دُہرانی پڑتی ہے۔

بیزار ہو کر گری لال نے مکندی کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "مکندی، بات کیا ہے آخر؟"

"کچھ نہیں" پہلے تو مکندی نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی کرسی گری لال

کے پاس سرکائی اور بولا۔ ”سن یار، ایک عجیب سی بات ہوئی۔“ اور پھر وہ رُک گیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اب بھی بتائے یا نہ بتائے۔

”بڑا کمینہ ہے، یار تو۔“ گری نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا بات ہے جو تو گری سے چھپائے گا؟“

”بتاتا ہوں۔“ مکندی راز داری کے انداز میں اپنا منہ گری لال کے کانوں کے پاس کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ سونفیا۔۔۔“

”ہاں ہاں، سونفیا؟“!

”ہم جتنا اسے برف کا تودہ سمجھ رہے تھے، اتنی ہی وہ آگ نکلی۔“

”سچ؟“ اور گری لال کا چہرہ بھی تمتمانے لگا اور پھر اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”کہاں، کیسے ہوا یہ سب؟ اسے کیا شیلو اور تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تھا؟“

”نہیں۔“ مکندی نے جواب دیا۔ ”ہم تو اس کے کلب میں آنے سے پہلے ہی وہاں

سے نکل کر دریا کے کنارے چلے گئے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر۔" مکندی نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سونفیا کے رام ہو جانے کی کوئی بڑی لمبی چوڑی وجہ بیان کرنے جا رہا ہے لیکن جبھی سامنے، بر آمدے کی طرف اس کا ڈاشنڈ، رکی، کوئی اجنبی بو پاتا، بھونکتا ہوا چلا آیا۔

"رکی۔۔۔رکی۔" مکندی نے پکارا لیکن وہ گری کے پاس پہنچ کر اسے سونگھ چکا تھا۔ پھر مکندی کے پاس آتے ہوئے اس نے اسے سونگھا، سر اُٹھا کر اس کے منہ کی طرف دیکھا اور دُم ہلا ہلا کر وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں چاٹنے لگا۔ مکندی نے مسکراتے ہوئے گری لال کی طرف دیکھا اور پھر رکی کو اُٹھا کر اس کے بدن پہ ہاتھ پھیرنے، اس سے پیار کرنے لگا۔

جوگیا

نہادھو کر نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے۔ جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور میں اپنے ہاں سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازے کے ساتھ جو لگا تو چوں کی ایک بے سری آواز پیدا ہوئی۔ بڑے بھیا جو پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے مڑ کر بولے۔ کیا ہے جگل؟ کچھ نہیں موٹے بھیا۔ میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا، ”گرمی بہت ہے“ اور میں پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ساڑھی کے سلسلے میں جوگیا آج کون سا رنگ چنتی ہے۔

میں جے جے سکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا۔ رنگ میرے حواس پہ چھائے

رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے۔ اور آج بھی ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ بے معنی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبا دیوی کی وادی شیٹ آگیاری لین میں تھا۔ پارسیوں کی آگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے۔ آمنے سامنے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیں کہیں توماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی ملائم ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد و عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ سینہ بہ سینہ لب بہ لب، غلیظ اور مقدس۔۔۔

سامنے بانپو گھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا۔ ابھی بجور کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے تل اور تیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک رہی ہے جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب پتہ چلتا تھا۔ ایسے

ہی انہیں بھی ہمارا سب اگیان نظر آتا ہو گا۔

جو گیا کے مکان کا نام تو رنچھوڑ نواس تھا۔ لیکن میں اسے با نپو گھر کی قسم کا مکان اس لیے کہتا ہوں کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں۔ جن میں سے ایک جو گیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی کے گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی، جس سے اپنا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جو گیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوب صورت لڑکی تھی قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے پرے اور گھٹے ہونے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ جو گیا دال، رنگنا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی شری کھنڈ سے اتنی تندرست ہو سکتی تھی۔ بہر حال ان لڑکیوں کا کچھ مت کہیے جو بھی کھاتی ہیں الم غلم، ان کے بدن کو لگتا ہے۔ جو گیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا تھا۔ جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں رات کے اندھیرے میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی جیسا ناک اور

ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹنکے ہوئے تھے۔ سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنہیں وہ کبھی ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر مچلتی رہتیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا پورا تارامنڈل تھا۔ جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جو گیا یوں بڑی بھولی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت کیا کرنا ہے۔ یہ وہی جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا، جس نے اس کے حسن کو دو بالا کر دیا تھا۔ گڑبڑ تھی تو بس رنگ کی۔ کیونکہ جو گیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا۔ جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی کی چیزیں اتنی مناسب نہ ہوتیں تو بس چھٹی ہو گئی تھی۔

میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو گیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے۔ جو گیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی، جو گیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی

عجیب سہیل پنا تھا۔ کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جو گیا اٹھارہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی، جسے صرف جو گیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے۔ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے۔ اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جو گیا سب کو سبق دے جاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا ایسی رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ تھا۔ لیکن میری مجبوریاں تھیں، میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا خیال آتا تھا۔ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، بنا کسی التہاب کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں؟ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہو گی؟ شاید ان کو کوئی ایسا لطف ملتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو۔ لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور اِدھر اُدھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذّذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا

ہو گا؟ یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جو گیا کے پنڈے کو لگ گیا ہو گا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے اس کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے۔ اور پھر پارسیوں کی آگیاری کے پاس مل جاتے۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر ہی بیٹھا ہوتا اور منہ میں ژند اوستا پڑھتا رہتا۔ وہ صرف ہمارے سروش کو سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اسے ضرور صاحب جی کہتے اور پھر اس راستے پہ چل دیتے جو دنیا کے لہو و لعب میٹرو سینما کی طرف جاتا تھا۔ جہاں پہنچ کر جو گیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے سکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پہ کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس

بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ صرف میں اور جو گیا پہنچے تھے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے محسوس کرنے کے لیے۔ پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی بھی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے۔ "جو ہو میں ایک صبح، کے نام ایک بڑی سی تصویر تھی۔ جس میں اوپر کے حصّے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدے طریقے سے تھوپا اور پچارا گیا تھا۔ جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا۔ جس پر جو گیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا۔ محبت میں ایک قدم بھی بعض وقت سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ دیکھنے کوئی آتا مرتا ہے یا نہیں۔ اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا۔ جبھی ہم دونوں کے اکیلے ہونے نے پورے ہال کو بھر دیا۔

اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، ٹھٹکا اور پھر اسٹول کے پاس جوگیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو اتنا ”جوگیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔“

”سامنے آ کے سناؤ“ بولی۔

میں نے کہا ”لطیفہ ہی ایسا ہے۔“

میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے اس کے کانوں کی لوؤں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ آخر میں نے لطیفہ شروع کیا، ”ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا۔“

”ہوں“ جوگیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا۔“

اس پر جو گیا نے تین چوتھائی میں میرے طرف دیکھا۔

"تم لطیفہ سنا رہے ہو۔"

"ہاں" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جو گیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، منتظر۔۔۔ ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا جس میں لمحات کے شرارے، کسی بارود سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہے تھے۔ خلا میں پھٹ رہے تھے اور آخر معدومیت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے۔ جبھی 'جو ہو میں ایک صبح' میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پہ پڑی اور میں نے کہا، "وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آگئی۔ آخر اس نے سوچا۔ اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں۔ کیوں نہ میں اسے کوئی ایسا موقع دوں۔ شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلا لیا۔ لڑکا آپ ہی گلدستہ بھی لایا۔ جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا، ہائے۔ کتنا پیارا ہے یہ اُودے میں گلابی۔ گلابی میں سفید رنگ کے پھول۔"

"پھر؟" جو گیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"ان کے بدلے تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے" پھر۔۔۔ لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا، مگر۔۔۔ وہ لڑکا باہر جارہا تھا دروازے کی طرف۔

"ہے بھگوان" اور جو گیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا تھا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکی بولی۔ کہاں جارہے ہو لالی۔ جس پر لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا۔ اور پھول لینے۔"

اس سے پہلے کہ جو گیا ہنستی اور اس کا انتظار ابدیت پہ چھا جاتا میں نے اس کو چُوم لیا۔ وہ ہنس نہ سکتی تھی کیونکہ وہ خفا تھی اور خوش بھی محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں نے ہرا کر دیا تھا۔ اس دن اگر ہم جو شیلے، گہرے رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جو گیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا۔

اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی۔

جس کا نام تھا "کوئی کسی کا نہیں" اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیے رو رہی تھی سب رنگوں میں اداسی تھی اور ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا، جب کہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی جو گیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا مکا دکھایا، مُسکرائی اور دوڑ گئی۔

کچھ دیر یونہی ادھر ادھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا۔ دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی جلی دکھائی دے رہی تھی۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، پیلا، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا، ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ میرا گلا تشکّر کے احساس سے رندا ہوا تھا، میں کسی کا شکریہ ادا کر رہا تھا؟ اسی ایک لمس سے جو گیا ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی تھی، میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے

ساتھ بیاہ بھی کر لیتی جب بھی وہ میری تھی جس میں سچائی ہو ولولہ ہو بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے۔

تو گویا اس دن میں دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساڑھی جو گیا اپنی الماری سے نکالتی ہے اگر وہ مجھے میرے ہاں کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی آج کون سی ساڑھی پہنوں اور اسی میں سارا مزہ کر کرا ہو جاتا، میں تو جاننا چاہتا تھا صبح سویرے نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساڑھیوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس میں کون سی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ آج فلاں رنگ کی ساڑھی پہننی چاہیے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پراسرار ہے۔ پر پیچ۔ پھیر اتنا ہے اس میں کہ مرد اس کی تہہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا، سنا ہے چاند نہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پہ بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں۔ وہ تو سب سورج سے مُستعار لیتا ہے جبھی، جبھی ساڑھی پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے آج کون سی ساڑھی پہنوں۔

نہیں نہیں۔ اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ پھر کسی کو کوئی مرد تھوڑا بتانے جاتا ہے پھر رات کا بھی تو ایک رنگ ہوتا ہے۔ اس کا اپنا رنگ۔ اس دن واقعی بہت گرمی تھی نیچے وادی شیٹ آگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا موسم کی بھٹیارن دانے بھون رہی ہے جب کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے گزرا تو اوپر سے بالکل مکئی کا دانہ معلوم ہوا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیئے وہ سب ساڑھیاں تھیں، جن میں سے ایک جوگیا اپنے لیے، میرے لیے ساری دنیا کے لیے چن رہی تھی۔ یونہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی، اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہے، جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا ہے، ایسے گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا ہے اگر میں ہوتا تو جوگیا کو

یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا، جبھی میں نے سوچا، میں نے بہت چھپنے کی کوشش کی ہے لیکن جوگیا نے اپنے من میں بلا کر مجھے پوچھ ہی لیا تھا، پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل معلوم ہوتا تھا آگیاری تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا، ''آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے جوگی۔''

''میں جانتی تھی تم اسے پسند کروں گے۔''

''تم کیسے جانتی تھیں؟''

''ہوں''۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''آج تمہیں چھونے ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔''

''کیا جی چاہتا ہے۔''

اس وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ میں آگئی جسے نکلنے میں صدیاں لگیں۔ میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں جب تک ہم پرنسس سٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آ چکے تھے، جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا "آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔"

"روؤں؟ کیوں؟"

"شاستر کہتے ہیں آتما کے پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں۔"

"کون سا پاپ کیا ہے تمہاری آتما نے؟"

"ایسا پاپ جو میرا شریر نہ کر سکا۔"

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھ سکتیں۔ اور پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں، جو گیانہ سمجھ سکی اپنا ہی کوئی بچار اس کے من میں چلا آیا تھا "جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے۔"

"کیا، کیا۔ کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے۔" اور اس نے اپنے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی کی طرف شارہ کیا۔

"تمہیں اس میں چھپا کر امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے نہ آپ ہی واپس آؤں نہ تمہیں آنے دوں۔" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سے وہ کبھی آئی تھی۔

میں کچھ دیر کے لیے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پر لے گئی ہیں، جہاں سے وہ خود آئی ہیں اور نہ انہیں آنے دیا ہے۔ دیوتا بھی ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو پھر ایک سرد آہ بھر کے چلے جاتے ہیں۔

مڑ کر دیکھا تو جوگیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جوگیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی۔ جس کا احساس مجھے خاص دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے

پھٹی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر تبرّے سناتے آ جا رہے تھے۔ جبھی میں نے دیکھا خشک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے، وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی۔ لانبی اونچی کٹے ہوئے بال جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں دو تین چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں۔ یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا فرق تھا تو صرف اتنا کہ کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری اسکرٹ بھی دھانی تھی اور میں سوچتا رہ گیا تھا سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی ہوئی، بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کون سی بات کون سا ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے کہ آج مولسری پہننا چاہیے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال

کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے آپ کیسے دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے مثلاً سرسوں کا ساپیلا رنگ، چمپئی رنگ، گل اناری، کاسنی، فیروزی۔ لیکن وہ کون سا بے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار، سنسار ایک ہی رنگ سے بھر جاتا ہے، شاید یہ موسم کی بات ہے۔ یا ویسے بھی چاند کی بادل کی۔ شاید کوئی مروجہ فیشن کسی ایکٹرس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے۔؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بعض وقت وہ رنگا رنگ کپڑے بھی پہنتی ہے۔ اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساڑھیاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہ آرہا تھا۔ سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا، جب میں سکول پہنچا ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آرہے تھے۔ کچھ آکر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے ان میں سیکشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ ہلکا نیلا تھا۔

اگر ہیمنت میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہیمنت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں واسنت تھا۔ بہار، جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی، دنیا بھر میں کہیں کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی اور تضحیک رہتی تھی۔ جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے سالے چاہے کتنا زور لگا لے تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پہ گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے۔ بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں۔ اچھا کیا تیرے بدن پہ ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگے ہیں۔ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پر جھپٹتے ہیں اور اپنا منہ تیری شہ رگ سے لگا کر تیرا خون چوسا ہے۔ کیا تو اس وقت بچوں کی طرح رویا ہے جب تیری تصویر انعامی مقابلے میں اوّل آئی ہو۔ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنویں میں دھکیل کر چل دیئے ہیں۔ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پہ چڑھایا گیا تھا وہ تو تھا۔ تیرے چہرے پہ سیاہیاں چھٹی ہیں اور اس پر کے

خط اتنے سخت اور گھناؤنے اور طاقت ور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میورلز؟ جس سے متوحش ہو کر۔۔۔

آج پھر میں نے اسے بتایا شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا رنگ پہنے نکل آئی ہیں۔ ہیمنت نے اپنے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا، جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے میں نے سیکشی کی طرف اشارہ کیا، جسے ہم ماڈل کہا کرتے تھے، وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی میں نے کہا، "دیکھو! آج یہ بھی نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے۔"

ہیمنت نے کچھ نہ کہا، میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لان پہ لے آیا جو پام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا، وہاں ایک کنارے پہ پہنچ کر وہ باڑھ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وکٹوریہ ٹرمینس اور ہارن بائی روڈ کی طرف۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب میرا وہم ہے۔ وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ اگر عورتیں اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھیوں میں چھپا کر اوپر امبروں پہ اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد

نظر نہ آتے۔ لیکن چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ گھوم پھر رہے تھے۔ جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں سروکار ہی نہ تھا۔ کوئی لانبا تھا کوئی ناٹا۔ کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور توندیلا۔ اور سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جبھی ادھر سے لوہے کی بنی ہوئی گاٹن گزری جس نے ہرے رنگ کا کانٹا لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیمنت بولا، ”پہچان اپنی ماں کو۔۔۔“

”میں نے بیکار کی عذر داری کی، میں ان بے چاری غریب عورتوں کی بات نہیں کرتا۔“

”کن کی کرتے ہو۔“

”ان کی جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔“

جبھی میری بدقسمتی سے ایک سیڈان سامنے پارسی دارو والے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اسی جماعت کی نمائندہ تھی جس کے

پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں، اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ اپنی وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندریوں کا وہ بے تار برقی پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دوکان دار انواع واقسام کا ڈھیر لگادے اور وہ ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔

وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی۔ اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پچاس فٹ چوڑی سڑک کے اس پار مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی۔ لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلے کا سا رنگ نہ چلے گا۔ کتنا سوقیانہ تھا مذاق اس کا۔

ایسے ہی میں ہیمنت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساڑھیاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے۔ لیکن جب ہیمنت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔ آخر میں نے

اسے اپنے دماغ کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

لیکن وہ چھوٹتا کیسے؟ ایک دن جوگیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساڑھی کا بے حد خوب صورت امتزاج پیدا کر رکھا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی کمبی نیشن کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو اتنا تھا کہ کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساڑھی کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کا ایک آدھ تار جھلملا رہا تھا۔

کئی موسم بدلے، خزاں گئی تو بہار آئی۔ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار بمبئی میں آ سکتی ہیں، اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع ہوئی، ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو غایت درجے گداز کر دیتی ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا، اس پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ سبک سی ہوا پانی پہ دوشالہ بُن دیتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زمرد گھلا کہ نیلم ہو گیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پہ صوت و تجلی کا ٹکراؤ ہوا۔

بادل گرجے، بجلی تڑپی اور یکایک چھاجوں پانی پڑنے لگا۔ اس سلسلے میں جوگیا نے کئی نیلے، پیلے، کالے، اُودے، سردئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے۔ اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی۔ پھر عورت سے ماں بن جانے کی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے ہوں گے تو جڑواں ہوں گے، بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیسے سنبھالوں گا!! اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پڑ کر اس سے لپ سٹک لگانے کی اجازت لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جارہی تھی تو دوسری طرف لپک لپک کر کِھل رہی تھی۔ جوگیا نے لپ سٹک لگانے کی اجازت تو لے لی تھی، لیکن اتنی ساڑھیوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنی لپ سٹک کہاں سے لاتی۔ میں نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ سٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش ہوئی جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ میرے ساتھ گرگام کے ٹرام کے پھٹے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ

گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں ہی اندر دھنس گئیں اور نمی سی باہر جھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ جوگیا بے حد جذباتی لڑکی ہے، بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن بات دوسری تھی۔ جس رنگ کی میں لپ سٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساڑھی جوگیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوب صورت سی ساڑھی خرید کر سے دے سکتا۔ میں نے تو لپ سٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا کی جیب سے چرائے تھے۔ یا بھابھی کے ساتھ اس عشق میں بٹورے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشا ہوا۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے کچھ عقیق بیچ ڈالے، اور میری لپ سٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ساڑھی خرید لی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا؟ لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی، جوگیا کی سہیلی، ہیما۔ جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساڑھی پہنی اور جب ہم آگیاری پار لاقانونیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جوگیا کو چھیڑا، ”جانتی ہو جوگیا آج تم کیا

لگتی ہو؟"

"کیا لگتی ہوں؟"

"بیر بہوٹی۔ جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے۔"

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو، تم کون ہو؟"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے اور ساڑھی کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہیں رہا۔ اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہیمنت سے کہہ دیا۔ اب کے ہیمنت نے اکیلے نہیں، تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہِ عام پر میری بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سیکشی وہاں نہ آ جاتی۔ جو سفید نائیلون کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آ رہی تھی۔ وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جا رہی تھی۔

جو گیا کو بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی، اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا، لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں سکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں یا تصویریں بنا کر مالا بار ہل اور وارڈن روڈ کے جھوٹے دقیقہ شناسوں کو اونے پونے میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لئے وقت چاہئے تھا، جو میرے پاس تو بہت تھا، تھوڑا بہت جو گیا کے پاس بھی تھا، لیکن ماں کے پاس نہ تھا۔ محنت اور مشقت کی وجہ سے اسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابھی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں، لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہیما بانپو گھر میں جو گیا کے پیار دلار لیتی ہوئی ایکا ایکی اپنے گھر میں آ نکلتی اور دھڑ سے کہہ ڈالتی، ”کاکا کیوں نہیں تم جو گیا سے بیاہ کر لیتے؟“

اور میں ہمیشہ کہتا، ’دھت‘ یہ ’دھت‘ اگر میں ہی کہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ دن بعد ہیما کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا بھابھی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک

دن تو بھابھی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہلیز پر جا گری۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جوگیا اور بجور کی ماؤں اور پنجابن نے مل کر بھابھی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ بانپو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں۔ ان سے بات کر لینا، ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ بار اشارے سے رام کرنا ٹھیک تھا۔ لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہ تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال ان کا زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں۔ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا چوڑا دے دلا نہیں سکتی تھی۔ اسی لئے جب ہمارے گھروں میں کوئی لڑکی جوان ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں "تیار ہو گئی مرنے کو۔" خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھابھی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ جوگیا کا باپ کون تھا، کوئی کہتی وہ

مسلمان تھا۔ اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک پرتگالی تھا جو بڑودے میں بڑے عرصے تک رہا تھا۔ جو بھی ہو، وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے پتہ چلی تھی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں منادور کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہ مانا۔ جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی۔ مگر لوگ جوگیا کی ماں ایک برہمن عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے نہ پڑنے دیا اور وہ بمبئی چلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا۔ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور شفقت کا منہ آج تک نہ دیکھا تھا۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے، جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا۔ لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اس قدر صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ جلدی جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے مجھ

سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جو گیا اب کالج نہ جاتی تھی۔ اور باپو گھر کے جو گیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے جھونکے کے لئے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی۔ سرِ شام ہی اندھیرے کے چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے تھے، کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑتے جا رہے ہیں۔ ان شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔ حبس اور جانکاہی کا رنگ۔ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آتی ہیں، وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف محبوبہ اور ماں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی، اور جو گیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

افوہ اتنی گھٹن، اتنی اداسی۔۔۔ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ میلا چھدرا چھدرا، جیسے منہ میں ریت کے بے شمار ذرّے۔ اور پھر اس میں ایک عفونت

ہوتی ہے جس سے متلی ہوتی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا، تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے سات چلنے پر راضی ہو جاتی تو میں اسے لے کر کہیں بھی نکل جاتا۔ جبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بودھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لے کر اپنے پیٹ میں ڈال دیتے ہیں اور 'اوم منے پدمے ہم'کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا، لیکن سامنے بانپو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھُلا، اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں سے نہیں سوئی۔ اس کے بال بے حد روکھے تھے اور یوں ہی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے۔ اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی۔ کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی۔

میں اسکول کی طرف جارہا تھا، راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں کس نے بتایا تھا؟ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی اور ہونٹوں پر بھجن تھے۔ جو نہ کسی کو سنائی دے رہے تھے نہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھکشو بنی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جارہی تھیں، اور انہیں کھٹکھٹا رہی تھیں لیکن اس بھرے پرے شہر بمبئی میں کوئی بھی انہیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہیں آرہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی، بولا، ”شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے؟“ میں اس بے حس آدمی کو کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ میرے منہ سے نکل گیا ”آج وہ سب جوگنیں بن گئی ہیں، سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے۔“

اس دن میں اسے اور سیکشی کو گل مہر کے نیچے سے، پام کے پیڑوں میں گھسیٹتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے

ساکت تھے، ان سب نے بیراگ لے لیا تھا اور جوگیا کھتیاں پہنے بلا ارادہ، بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں، کوئی عورت نہیں، جسے ان کو جواب دینا ہے۔ میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جوگیا کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں کمنڈل لئے جارہی تھی۔ ہیمنت کھکھلا کے ہنسا۔ ساتھ ہی سیکشی بھی ہنسی۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی۔

جب ہیمنت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا، "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے جگل، کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو اُودے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے اور وہ تجھے کمنڈل دکھائی دیتا ہے۔ پرس ہے خوبصورت سا۔" سیکشی نے بھی ہیمنت کی تائید کی۔ میں حواس باختہ کھڑا سامنے سڑک پر دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس آکر رکی اور اس میں سے ایک لڑکی اتری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ وہ جوگن ہے۔ جوگیا کپڑے پہنے ہوئے۔ میں اندھا ہوں۔۔۔ لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لئے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا

اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی "ہیمنت" ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ویسے ہی بے یار و مدد گار اس صحرا میں چھوڑ گئے تھے جیسے لوگ کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے اور نہ مجھے اولیا کہا تھا۔

اور وہ لڑکی اس طرف آ رہی تھی۔ اب تو مجھے پورے سنسار پہ پھیلے ہوئے رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی آواز کے ساتھ ہیمنت اور سیکشی کو پکارتا، وہ میرے قریب آ چکی تھی۔ میں نے ایک آواز سنی "بیر" اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ خود جوگیا تھی۔ جسے میں نے صبح اپنے گیان بھون سے باپو گھر کے کھلے دروازے سے سب ساڑھیوں میں سے جوگیا رنگ کی ساڑھی کا انتخاب کرتے دیکھا تھا۔

ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور عجیب بے بسی کے عالم میں رک گیا۔ جوگیا بولی، "میں کل بڑودہ جا رہی ہوں۔"

”کیوں جوگیا، بڑودہ میں کیا ہے؟“

”میری ننھیال، وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے پرسوں۔“

”او۔۔۔“

”میں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”تو ملو۔“ میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔‘

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل اور کچھ دوسرے لوگ آ رہے تھے۔ جب کہ جوگیا نے اچک کر اتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں بوکھلا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس کی بجائے پینتیس چالیس سال کی بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو وہ ہمیں دکھائی نہیں دیئے۔ وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے۔؟ جاتے ہوئے جوگیا نے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں ماروں گی۔ ہاں!“ اور ساتھ ہی اس نے مکا دکھا دیا۔ اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی۔

سویرے گیان بھون اور باپنو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی۔ جس پر بازار کا بوجھ اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور ٹرنک رکھ رہے تھے، کچھ یوں ہی ادھر ادھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے باپنو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے، لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابھی تو کیا آتے۔ معصوم ہیما کو بھی انہوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا۔ جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آرہی تھی۔

پہلے بجور کی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑا سانس درست کیا اور سب کی طرف ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔ ”اچھا بہنو، ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے۔۔۔“

اور پھر آئی جوگیا۔ جوگیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوب صورت ساڑھی پہن رکھی تھی اور گلاب کا ہی ایک پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر آنکلا۔

میں نے عادتاً کہا۔

"صاحب جی"

"صاحب جی" پارسی پروہت نے جواب دیا اور پھر مجھے اور جو گیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر مسکرایا۔ آشیر واد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جو گیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

جب میں بھی مسکرا دیا۔

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجونتی دے بوٹے"

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری، ہاتھ بھی لگاؤ کملا جاتے ہیں)

ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہوگئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی۔۔۔

گلی گلی، محلّے محلّے میں ''پھر بساؤ'' کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ ''کاروبار میں بساؤ''، ''زمین پر بساؤ'' اور ''گھروں میں بساؤ'' پروگرام شروع کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا ''دل میں بساؤ'' اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے ''ملّا شکور'' میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سیکریٹری چُن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلّے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو۔۔۔لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور

نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے۔ ”ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجونتی دے بوٹے۔“ تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا۔ جانے وہ کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہو گی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا۔ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے، لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر

پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح، نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی، ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھر کم سندر لال پہلے تو گھبرایا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا، جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجو نتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی، اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے

ہوئے کہہ اٹھتی، ’’پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی۔‘‘ صاف پتہ چلتا تھا، وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں، بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں۔ ’’لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا، عورت جس کے قابو میں نہیں آتی۔‘‘ اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولھا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا، ’’تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہو گی۔‘‘ لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا، مگر وہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدّے سے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے۔

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا۔

ایک بار صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسالوں اور لوگوں کو بتا دوں۔ ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا۔ ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا، جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا۔ انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیئے جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ کیونکہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح۔۔۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے۔

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلّہ ملّا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر

چوکیداری کرنے والے کتّے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے

تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز

سُن کر صرف اتنا کہتے۔ او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی

سے وہ بابو سندر لال کا پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ

گئی تھیں، گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے

پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر

احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر

کے لے آنکھیں کھولتا اور ''دل میں بساؤ'' کے فریادی اور اندوہ گیں پروپیگنڈے

کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے

ساتھ دماغ میں چکّر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں

سمجھتا، پر گُنگُناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں

دنوں، جب کہ مِس مردولا سارا بھائی، ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ

عورتیں تبادلے میں لائیں، تو محلّہ ملّا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی ''مہندر سنگھ زندہ باد'' اور کبھی ''سوہن لال زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ اور وہ نعرے لگاتے رہے، حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے۔

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفّت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھالیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔

کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی۔ سہاگ ونتی۔۔۔ سہاگ والی۔ اور اپنے بھائی کو اس جمِّ غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی۔ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے۔ اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا، جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں، ان میں لاجو نہ تھی۔ سندرلال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے، بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے، اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے

جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیک دان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈا سپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام، محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے۔ لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے، اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا، لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا۔ لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر، جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں، وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے

قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوارامائن کا وہ حصّہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا۔ میں راجا رام چندر نہیں، جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چندر جی نے مہاستو نتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی۔ ”کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے۔۔۔؟“ نارائن باوا نے کہا۔ ”یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔“

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور اشلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا،

”ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیئے بابا۔“

”چپ رہو جی۔“

”تم کون ہوتے ہو؟“

”خاموش!“ مجمع سے آوازیں آئیں اور سندرلال نے بڑھ کر کہا، ”مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

پھر ملی جلی آوازیں آئیں، ”خاموش“!

”ہم نہیں بولنے دیں گے۔“ اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی۔ ”مار دیں گے۔“

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ ”تم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندرلال۔“

سندرلال نے کہا۔ ”میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا۔ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے، لیکن سندرلال کی نہیں۔“

ان لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں،

اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے۔ ”سنو، سنو، سنو۔۔۔“

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے۔ ”شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی! انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟“

نارائن بابا نے اپنی ڈاڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔“

”ہاں بابا“ سندر لال بابو نے کہا۔ ”اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے، جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے۔ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس

میں سیتا کے ستیہ اور اَستیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی، جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟“

”آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے۔سیتا۔ لاجونتی۔“ اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیے تھے اور پھر وہ سب ”سندر لال بابو زندہ باد“ کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا۔ ”مہاستی سیتا زندہ باد“ ایک طرف سے آواز آئی، ”شری رام چندر۔۔۔“

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں، ”خاموش! خاموش!“ اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے، جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ محرر چوکی کلاں، جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمیں پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے۔ اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ

رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے۔

''ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجو نتی دے بوٹے''

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملّا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کرب ناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا ''گرائیں'' لال چند، جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا، ''بدھائی ہو سندر لال۔''

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا، ''کس بات کی بدھائی لال چند؟''

''میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔''

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا، ''کہاں دیکھا

ہے؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

"واہگہ کی سرحد پر۔"

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا، "کوئی اور ہو گی۔"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا، "نہیں بھیّا، وہ لاجو ہی تھی، لاجو۔۔۔"

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حُقّے پر سے اٹھالی اور بولا، "بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر۔۔۔"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا، "تیسرا ماتھے پر" وہ نہیں چاہتا تھا، اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے

سارے تیندولے یاد آ گئے، جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے، جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کملانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی۔ اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لُٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو۔ سندر لال کا سارا جسم ایک اَن جانے خوف، ایک اَن جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا، ”لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟“

لال چند نے کہا، ”ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھانا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا، ”سچ مچ آ گئی ہے لاجونتی بھابی؟“

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "واہگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔۔۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹئیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں، ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا، "تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو۔ دیکھو۔ جتنی عورتیں تم نے دی ہیں، ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔"

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا "مال" واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا، "لاجو۔۔۔ لاجو بھابی۔" مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی

بھی پر نہ آئی۔ اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا، جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں، زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منھ سے اتنا بھی نہیں نکلتا، "پانی دے دو۔" اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے بٹوارے کے بعد کا تشدّد ابھی تک کار فرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو۔ تو وہ جھٹ سے کہتا، "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدّد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر

اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں ''گپتی'' کر لیتے۔ گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ''گپتی'' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا ''لین دین'' یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا، جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصّہ بیان کیا جاتا ہے۔ از بیک اَن گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں۔ از بک آگے گزر جاتا ہے اور نا قابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امر تسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً

دروازے کی طرف بڑھا، لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے، لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا، کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی، اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بِتا کر آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکّل مارے ہوئے تھی۔ عادتاً محض عادتاً۔۔ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیّاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور

مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق۔ دائیں بُکّل اور بائیں بُکّل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی، ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہو گئی تھی۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا، وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھُل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منھ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے بڑا صدمہ ہوا، لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا۔ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے

"موٹی" ہو گئی تھی اور "صحت مند" نظر آتی تھی، لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے۔"

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا، "ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت۔"

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گُم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلّاتی آواز آرہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدّت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید، کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصّے دار بنانا چاہتا ہے۔ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھِرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔

ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں، اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیّت دیے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شدّو مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنہیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملّا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروانہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ وہ اسے کہتا تھا ”دیوی!“ اور لاجو ایک اَن جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں۔ لیکن سندر لال، لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھُل جانے میں بھی ایک طرح سے سِمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ”نہیں“ ”یو نہیں“ ”اُوں ہوں“ کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے ”سیاہ دنوں“ کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

”کون تھا وہ؟“

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا، ”جُماں“ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی

نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا، ''اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟''

''ہاں۔''

''مارتا تو نہیں تھا؟''

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا، ''نہیں۔'' اور پھر بولی، ''وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی۔ اب تو نہ مارو گے؟'' سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا، ''نہیں دیوی! اب نہیں۔ نہیں ماروں گا۔۔۔''

''دیوی!'' لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی، لیکن سندر لال نے کہا، ''جانے دو بیتی باتیں۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں

کرتا، اپنی کرتا ہے۔“

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب ”دیوی“ کا بدن ہو چکا تھا لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی، جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پاکر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی۔ وہ سندر لال کی، وہ پرانی لاجو ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے، جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب

کچھ ہو سکتی ہے، پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجڑ گئی۔ سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان۔ پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملّا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

"ہتھ لائیاں کمھلاں نی، لاجو نتی دے بوٹے۔۔۔"